میٹرک کے امتحانات سے فارغ طلبہ کے اوقات کا بہترین مصرف

قرآن کالج آف آرٹس اینڈ سائنس

191۔ اتاترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور (فون: 5833637)

کے زیر اہتمام اِس سال

اسلامک جنرل نالج ورکشاپ

کا انعقاد — 13 مئی تا 12 جون 2004ء — ہوگا' ان شاء اللہ

❁ اوقات: صبح 8:30 تا دوپہر 12:10 روزانہ

❁ مضامین

1) تجوید و ناظرہ
2) مطالعہ قرآن حکیم
3) مطالعۂ حدیث
4) تعارف ارکان اسلام' مسائل نماز
5) کمپیوٹر EDP
6) بنیادی انگلش گرامر پر خصوصی لیکچرز

❁ کورس کے اختتام پر کامیاب طلبہ میں اسناد تقسیم کی جائیں گی۔

❁ ہاسٹل میں محدود سہولت دستیاب ہے۔ ہاسٹل میں مقیم طلبہ کو شام کے اوقات میں بھی مصروف رکھنے کا اہتمام ہوگا۔ ان شاء اللہ

نوٹ: کورس فیس 500 روپے' جبکہ ہاسٹل میں مقیم طلبہ کے لئے زرِطعام/رہائش 1500 روپے

ان مستحق طلبہ کے لئے جو واجبات ادا نہ کر سکتے ہوں' خصوصی رعایت کی سہولت

المعلن: پروفیسر طارق مسعود پرنسپل قرآن کالج

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ : ۲۶۹)

دار القرآن اکیڈمی
نمبر 17-4-06
۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد

مدیر منتظم: حافظ عاکف سعید

نائب مدیر: حافظ خالد محمود خضر

ادارہ تحریر:
پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی۔ پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

جلد ۲۳ | صفر المظفر ۱۴۲۵ھ - اپریل ۲۰۰۴ء | شمارہ ۴

یکے از مطبوعات
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶۔کے۔ماڈل ٹاؤن۔لاہور ۱۴۔فون: ۵۸۶۹۵۰۱
ویب سائٹ: www.tanzeem.org

سالانہ زرِتعاون: 100 روپے' فی شمارہ: 10 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ: 700 روپے امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ: 900 روپے

حرفِ اول

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معرکہ ایمان و مادّیت میں اہل ایمان کی ذمہ داری

سائنسی ترقی کی چکاچوند کے باعث آج کے انسان کی نظریں ظاہر میں الجھ کر رہ گئی ہیں اور مادے کی بوقلمونیوں کے پیچھے کارفرما فاعل حقیقی یعنی ذات باری تعالیٰ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی ہے۔ جبکہ اس دنیا میں انسان کا امتحان یہی ہے کہ وہ اپنے دل میں چھپی ہوئی اللہ کی معرفت و محبت کی چنگاری کو اہمیت دیتا ہے یا مادی ظواہر ہی میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

''معرکہ ایمان و مادیت'' کا آغاز اگرچہ اُسی وقت سے ہوگیا تھا جب شیطان نے ذریتِ آدمؑ کو راہِ حق سے بھٹکانے کے لئے مہلت مانگی تھی' لیکن موجودہ دور میں حق و باطل کی یہ کشمکش اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے۔ شیطان اور اس کے ایجنٹوں کی کوششوں سے جہاں عام مسلمانوں کے لئے راہِ حق پر چلنا مشکل ہوگیا ہے وہاں اہل ایمان بھی کٹھن مراحل سے گزر رہے ہیں۔ ان حالات میں اپنے ایمان کو بچانے کے لئے ہمیں قرآن حکیم سے یہی رہنمائی ملتی ہے کہ مادیت کے بجائے اللہ کی ذات پر مکمل بھروسہ ہو، قرآن سے وابستگی اختیار کی جائے اور ان لوگوں کے ساتھ تعلق رکھا جائے جن کا مقصد حیات صرف حصولِ رضائے الٰہی ہو اور جن کی نگاہیں دنیا کی چمک دمک سے خیرہ نہ ہوتی ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی بندگی کے لئے پیدا کیا ہے۔ لیکن موجودہ دجالی تہذیب نے انسانوں کو اللہ سے دور کر دیا ہے۔ چنانچہ ان حالات میں اہل ایمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ دجالی نظام کی جگہ اسلام کے نظام عدل اجتماعی کے قیام کے لئے جدوجہد کریں تاکہ انسانیت کو اللہ کی بندگی اور روحانی ترقی کے مواقع میسر ہوں۔ دورِ خلافت راشدہ نے دنیا کو جس روشن تہذیب اور کلچر سے متعارف کروایا اس کی نظیر پوری تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ لہٰذا انسانیت کی بھلائی اسی میں ہے کہ اسلام کے عادلانہ نظام کو قائم کیا جائے۔ لیکن اس کام کے لئے ایسے اصحاب یقین و عمل کی ضرورت ہے جن کے دل و دماغ مادے کے تاثر سے یکسر خالی ہوں اور جو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل اور ایمان رکھتے ہوں۔ oo

منتخب نصاب (درس ۲۶)

ڈاکٹر اسرار احمد

اُمت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں قرآنِ حکیم کی جامع ترین سورت

اُمُّ المُسَبِّحات : سورۃ الحدید

(۱۲)

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ..... امّا بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَھُمْ وَلَھُمْ اَجْرٌ کَرِیْمٌ ۞ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ ۚ وَالشُّھَدَآءُ عِنْدَ رَبِّھِمْ ؕ لَھُمْ اَجْرُھُمْ وَنُوْرُھُمْ ؕ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ۞﴾ (آیات ۱۸تا۱۹)

﴿وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا۞﴾ (النساء:۶۹) ..... صدق اللّٰہ العظیم

بعض اہم دینی اصطلاحات کے مابین ربط و تعلق

گزشتہ نشست میں سورۃ الحدید کی آیات ۱۶تا۱۸ کے حوالے سے سلوک قرآنی کو سمجھنے اور اس ضمن میں سورۃ النساء کی آیت ۶۹ کے حوالے سے دو اصطلاحات قرآنی ''صدّیقین''

اور ''شہداء'' کی اصل حقیقت سمجھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اب آپ کے سامنے ایک نقشہ پیش کیا جا رہا ہے' جو دین کی بعض اہم اصطلاحات کے مابین ربط و تعلق کے لئے بہت مفید ہے۔ اس نقشے میں دائیں اور بائیں دو انتہائیں وجود میں آ رہی ہیں۔ ایک طرف عروج ہے اور دوسری طرف نزول ہے' یعنی ایک عروجی کیفیت ہے اور ایک نزولی کیفیت ہے اور ان کے مابین base line ''عبدیت'' اور ''صالحیت'' ہے۔ ''عبدیت'' کی اصطلاح قرآن میں سب سے زیادہ استعمال ہوئی ہے۔ سورۃ البقرۃ کے تیسرے رکوع کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ﴾ ''اے لوگو! اپنے رب کی بندگی اختیار کرو''۔ لیکن سورۃ النساء کی آیت ۶۹ میں ''صالحین'' کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں چونکہ base line ہیں اس لئے ان دونوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ جس شخص نے فیصلہ کر لیا ہو کہ میں اللہ کا بندہ بن کر ہی زندگی گزاروں گا' وہ صالحین میں شامل ہو گیا۔

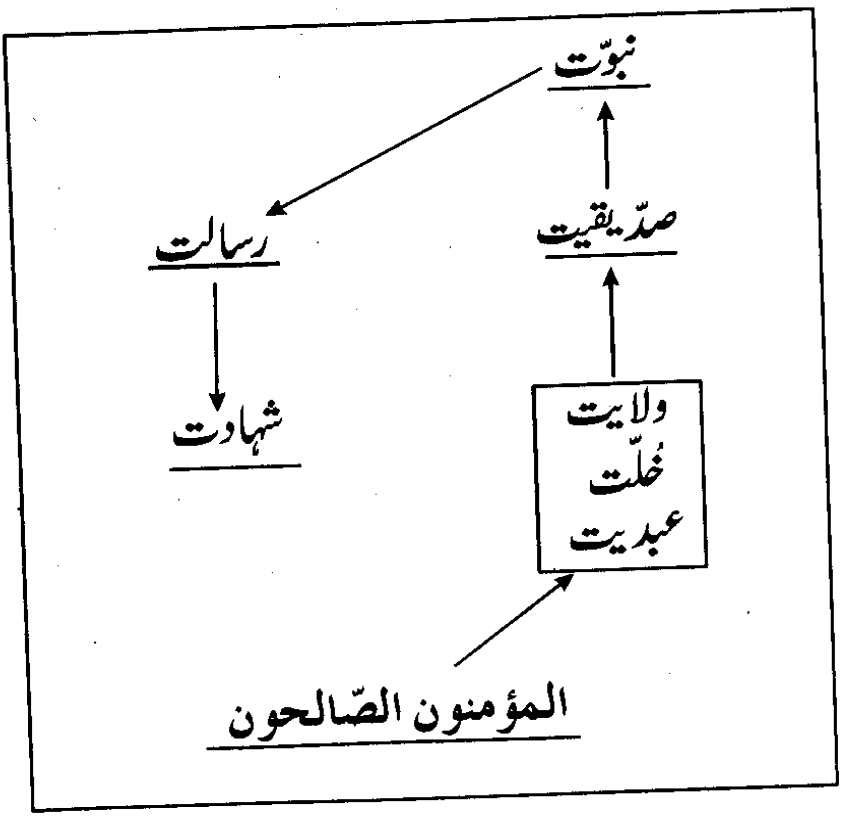

اب اس کے اوپر کے درجات کے لئے تین اصطلاحات ہیں اور یہ تینوں تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ ایک ہے ''ولایت'' یعنی اللہ کی دوستی۔ اس کی تفصیل سورۃ حٰمٓ السجدۃ میں بایں الفاظ آئی ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا .....﴾

''جن لوگوں نے کہا ہمارا ربّ اللہ ہے پھر اُس پر ثابت قدم رہے.....''

یعنی جن کو بھی اس عبدیت پر استقامت حاصل ہوگئی' جن کا بھی ایمان پر دل ٹھک گیا اور انہیں اللہ کے ساتھ تسلیم و رضا کی کیفیت حاصل ہوگئی' ان کا توکل کُل کا کُل اللہ کی ذات پر مرکوز ہو گیا اور وہ اطاعتِ کلی پر کاربند ہو گئے' تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

﴿اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ۝ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ ۝﴾ (یونس:۶۲'۶۳)

''آگاہ ہو جاؤ! یقیناً اللہ کے دوست تو وہ ہیں کہ جن پر (قیامت کے دن) نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور انہوں نے پرہیزگاری کی روش اختیار کی۔''

اس دوستی کے لئے ایک لفظ ''خُلّت'' بھی ہے اور یہ خاص طور پر حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کے لئے استعمال ہوا ہے۔ سورۃ النساء (آیت ۱۲۵) میں ارشاد ہوا: ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبۡرٰہِیۡمَ خَلِیۡلًا﴾ ''اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو اپنا خلیل بنالیا''۔ تو یہ ''ولایت'' اور ''خُلّت'' دو اصطلاحات ہیں۔ لیکن ایک اعتبار سے ''صدیقیت'' کی اصطلاح بھی ان کے ہم پلہ ہے۔ صدیق وہ شخص ہے جو نیک سرشت ہو' جو طبعاً نیک' راست باز' راست گو' راست رو ہو اور وہ ہر اچھی بات کی تصدیق کرنے کے لئے تیار اور آمادہ رہتا ہو۔ یہ ہے وہ مرتبہ جس کے اُوپر عروج کی آخری منزل ''نبوت'' ہے۔ میں نے اسی لئے ''رسالت'' کو نیچے رکھا ہے کہ میں ان حضرات کی رائے سے متفق ہوں جو رسالت کو مقامِ ''نزول'' میں سمجھتے ہیں' اس لئے کہ اصل عروج نبوت ہے۔ اس کے بعد حکم دیا جاتا ہے کہ اب اللہ کا پیغام لے کر لوگوں کی طرف جاؤ! یہ مقام رسالت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا تھا: ﴿اِذۡہَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّہٗ طَغٰی﴾ ''جاؤ فرعون کی طرف! یقیناً وہ سرکشی پر اتر آیا ہے''۔ یہ نزول اس اعتبار سے بھی بہت خوبصورت لفظ ہے کہ حضور ﷺ پر وحی نازل ہوئی جبکہ آپ جبلِ نور پر غارِ حرا میں تشریف فرما تھے۔ حضرت موسیٰؑ کو حکم ہو رہا ہے: ﴿اِذۡہَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّہٗ طَغٰی﴾ جبکہ آپؑ کوہ طور

پر اللہ سے ہم کلامی پر مشرف ہوئے۔ کہا جا رہا ہے کہ اب اس بلندی سے نیچے اترو اور جاؤ اللہ کا پیغام ہدایت لے کر لوگوں کی طرف۔

اس کیفیت کو علامہ اقبال نے شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے ایک قول کے حوالے سے اپنے چوتھے خطبے میں بہت خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ ایک بہت بڑے صوفی تھے۔ ان کا ایک جملہ ہے: ''محمد عربیؐ بالائے آسمان رفت و باز آمد' بخدا اگر من رفتمے باز نہ آمدمے'' یعنی محمد عربی ﷺ ساتویں آسمان پر چلے گئے اور پھر واپس آ گئے' خدا کی قسم! اگر میں وہاں پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

"This is the difference between prophetic experience and mystic experience."

دراصل صوفی اللہ کے ساتھ لو لگا کر بیٹھ رہتا ہے۔ اس کیفیت میں جو سرور و کیف ہے اس سے تو ظاہر ہے کہ وہی شخص آگاہ ہے جس کو یہ کیفیت نصیب ہو جائے۔ جیسے کہا جاتا ہے: ''لذتِ ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نہ چشی۔'' چنانچہ جس نے کبھی اس چیز کو چکھا نہ ہو وہ اس کے اندر جو سرور و کیف ہے اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔ اگر اللہ کے ساتھ لو لگی ہوئی ہے تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ع ''بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے''۔ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا ہی ایک اور واقعہ بھی روایات میں ملتا ہے کہ ایک بار مراقبے میں بیٹھے ہوئے تھے ـــــ اُس وقت جو بھی کیفیت ہو گی ہم اس کو نہیں سمجھ سکتے ـــــ کہ اچانک اقامت کی آواز آ گئی: قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ۔ اُس وقت انہیں کھڑے تو ہونا پڑا' لیکن کہا یہ کہ ''حضوری سے نکال کر دربانی میں کھڑا کر دیا''۔ یعنی مراقبے میں تو مجھے حضوری کی کیفیت حاصل تھی۔ لیکن بہرحال نماز کے لئے کھڑے ہو گئے' اس لئے کہ حکم خداوندی ﴿وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے جماعت میں شریک ہونا لازم ہے۔

تو ظاہر بات ہے جو اللہ کا بندہ اس مقامِ بلند پر پہنچ گیا ہو اب اسے کہا جائے کہ جاؤ تبلیغ کرو تو اس پر یہ گراں تو گزرے گا! تبلیغ دین میں تو لوگوں کی جلی کٹی سننی پڑتی ہیں۔ جیسے حضور ﷺ سے کوئی کہتا پاگل ہو گئے ہیں' کوئی کہتا دماغ خراب ہو گیا ہے' کوئی کہتا یقیناً اس سے ان کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے' یہ کوئی لیڈری چاہتے ہیں' یہ چاہتے ہیں کہ کچھ لوگ ان کے نام کی مالا جپیں۔ قرآن نے ان کے الفاظ نقل کئے ہیں: ﴿اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ﴾ کسی نے کہا جادوگر ہیں' کسی نے کہا شاعر ہیں۔ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ۔ نقل کفر کفر نباشد! تو اس سے حضور ﷺ کے دل پر جو بیت رہی تھی قرآن خود اُس پر اِن الفاظ میں تبصرہ فرماتا ہے:

﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ﴾ ''(اے نبیؐ!) ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس سے آپؐ کا سینہ بھنچتا ہے (آپ کو صدمہ پہنچتا ہے)''۔ اسی لئے کہا گیا: ﴿وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ﴾ ''صبر کیجئے اس پر جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں''۔ ہمیں خوب معلوم ہے کہ اس سے آپ کو تکلیف پہنچ رہی ہے' کوفت ہو رہی ہے' لیکن صبر کیجئے! اور یہ معاملہ صرف زبانی ایذاء تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کے بعد جسمانی ایذائیں بھی شروع ہو گئیں۔ تو رسالت میں تو یہ ساری مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ جبکہ نبوت و ولایت کے مقام پر آدمی آرام و سکون سے بیٹھا ہوتا ہے۔ صوفیاء تو صرف اُسے تذکیر کریں گے جو اُن کی خانقاہوں میں آئے گا' وہ دربدر تو نہیں جائیں گے' انہیں کسی کی کوئی کڑوی کسیلی بات نہیں سننی پڑے گی۔ خانقاہ تو گویا ایک ہسپتال ہے۔ جیسے کوئی مریض علاج کی غرض سے ہسپتال میں آتا ہے اسی طرح جس کے اندر احساس بیدار ہو گیا ہے اور وہ تزکیئے کا خواہاں ہے تو وہ خانقاہ میں حاضر ہو جائے گا اور اس کو جو بھی حکم دیا جائے گا وہ مانے گا۔ اس میں تزکیہ کرنے والے صوفی کو مشقت نہیں اٹھانا پڑتی' جبکہ رسول کا معاملہ اس کے برعکس ہے' وہ در در جا رہے ہیں اور کہیں کچھ سن رہے ہیں' کہیں کچھ سن رہے ہیں۔

اس مقامِ عروج و نزول کو مولانا رومؒ نے عالمِ جسمانی کی ایک مثال کے ذریعے بہت خوبصورتی سے واضح کیا ہے کہ جب سمندر میں سورج کی حرارت اور تمازت اثر انداز ہوتی ہے تو سمندر کا پانی بخارات کی شکل میں اوپر جا رہا ہوتا ہے۔ یہ بالکل صاف و شفاف مقطر پانی (distilled water) ہوتا ہے' اس میں کثافتیں (impurities) نہیں ہوتیں۔ یہی بخارات اوپر جا کر بادل کی شکل اختیار کرتے ہیں اور پھر بارش بن کر برستے ہیں۔ بخارات کا اوپر جانا عروج ہے اور بارش کا برسنا نزول ہے۔ جب وہی پانی بارش کی شکل میں برستا ہے تو سب سے پہلے فضا کو صاف کرتا ہے' پھر زمین کو صاف کرتا ہے۔ یعنی وہی پانی فضا اور زمین کی گندگیوں اور کثافتوں کو اپنے اندر لے کر نالوں اور دریاؤں سے ہوتا ہوا دوبارہ سمندر میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ گویا عروج اور نزول کا ایک سلسلہ ہے۔ اللہ کے نبیؐ جب رات کے وقت کھڑے ہوتے تھے تو وہ عروج کی کیفیت ہوتی تھی۔ یہ مقامِ عبدیت ہے' جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف رُخ ہے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی ہو رہی ہے۔ اور دن کے وقت جب دعوت و تبلیغ کے لئے گلیوں میں پھر رہے ہیں' گھر گھر جا رہے ہیں' لوگوں سے بات کر رہے ہیں اور ان کی جلی کٹی باتیں سننی پڑ رہی ہیں تو طبیعت میں ایک انقباض ہوتا ہے' کثافت پیدا

ہوتی ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ سے فرمایا گیا: ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ﴾ ''ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو باتیں یہ کہہ رہے ہیں ان سے آپ کا سینہ بھنچتا ہے''۔ لیکن آپ اندازہ کیجئے کہ کتنے لوگ ہیں جو اُس دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں پاک صاف ہو گئے؟ کتنوں کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وہ خود بھی عروج کی کیفیت حاصل کریں۔ تو دراصل رسالت مرتبۂ نزول میں ہے۔

قرآن مجید میں رسالت کے قریب ترین لفظ شہادت ہے۔ سورۃ المزمل میں ارشاد ہوا:

﴿اِنَّا اَرْسَلْنَا اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَیْکُمْ کَمَا اَرْسَلْنَا اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۝﴾

''(لوگو!) ہم نے تمہاری طرف ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول (یعنی موسیٰ علیہ السلام) بھیجا تھا۔''

سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہوا:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۝﴾

''اے نبی (ﷺ)! یقیناً ہم نے آپ کو بھیجا ہے گواہ بنا کر اور خوش خبری دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر''۔

یہاں تین صفات میں سب سے پہلے شاہد کا لفظ آیا ہے کہ ہم نے آپ کو گواہ بنا کر بھیجا ہے۔ یہ گواہی ہمیں اپنے قول سے بھی دینی ہے' جیسے ہم زبانی اقرار کرتے ہیں: اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۔ پھر ہمارا عمل بھی گواہی دے کہ واقعتاً ہم اللہ کے بندے ہیں اور ہم واقعتاً محمد ﷺ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں۔ پھر اِس گواہی کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ لوگوں کو جمع کرو اور ایک اجتماعی نظام قائم کرو' جو پوری دنیا کے اوپر گواہ بن جائے کہ بہترین نظام وہی ہے جو اللہ نے اپنے رسول ﷺ کے ذریعے سے عطا کیا ہے۔ اب ظاہر بات ہے اس کے لئے عملی جدوجہد درکار ہے۔ چنانچہ اس شہادت کے لئے اب ان لوگوں کی اہمیت زیادہ ہو جائے گی جن کے اندر قوتِ کار اور بھاگ دوڑ کی صلاحیت زیادہ ہے۔ جبکہ تصدیق کرنے میں وہ لوگ پیش قدمی کر جائیں گے جو سلیم الفطرت اور رقیق القلب ہیں۔ یہ ہیں اصل میں ''صدیقین'' اور ''شہداء'' کے دو مزاج۔ بیروں بیں (Extroverts) شہداء بنیں گے اور دروں بیں (introverts) صدیق بنیں گے' ان کو تصدیق کرنے میں دیر نہیں

لگے گی' پیش قدمی کر جائیں گے۔لیکن اس کے بعد عملی جدوجہد میں نبی کے دست و بازو بننے میں شہداء پیش پیش ہوں گے' جو بھاگ دوڑ کرنے والے ہیں۔حضرات ابوبکر و عثمان رضی اللہ عنہما اور نہ معلوم کتنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے کہ ان کے ایمان لانے کے بعد بھی مسلمانوں کو کھلم کھلا حرم میں جا کر نماز پڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔لیکن جس سال حضرات حمزہ و عمر رضی اللہ عنہما ایمان لے آئے تو اَب مسلمانوں نے ڈنکے کی چوٹ حرم میں جا کر نماز پڑھی۔حضرت مسیح علیہ السلام کا بڑا پیارا قول ہے: ''کتنے ہی ہیں جو بعد میں آتے ہیں لیکن پہلوں سے آگے نکل جاتے ہیں''۔حضور ﷺ نے جن کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد عظیم ترین انسان معین کیا ہے وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں جو پیغامِ ہدایت پہنچنے کے تقریباً چھ سال بعد ایمان لائے ہیں۔اندازہ کیجئے کہ آپؓ سے پہلے چھ سالوں میں کم از کم تیس چالیس افراد تو ایمان لا چکے ہوں گے' لیکن وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس لئے کہ آپؓ فعّال انسان ہیں' آپ کے قوائے عملیہ زیادہ چاق و چوبند ہیں۔جبکہ ایک وہ ہیں جن کے قوائے فکریہ و علمیہ کی حیثیت زیادہ ہے۔تو اس اعتبار سے ''صدیقیت'' بلند ترین منزل ہے اور ''شہادت'' اس سے نیچے ہے۔

سورۃ النساء کی آیت ۶۹ میں ارشاد ہوا:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝﴾

''جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے' یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین۔اور کیا ہی اچھی ہے ان لوگوں کی رفاقت۔''

یعنی جو کوئی بھی معنوی طور پر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر کاربند ہو جائے گا اسے ان لوگوں کی ایک معیت و رفاقت حاصل ہو گی جن پر اللہ کا انعام ہوا ہے۔ان میں سب سے پہلے انبیاء ہیں' ان سے نیچے صدیقین ہیں' ان سے نیچے شہداء کا رتبہ ہے اور پھر سب سے نیچے صالحین ہیں جو base line ہے۔یہ ہے درحقیقت وہ ربط و تعلق جو ان الفاظ کے مابین ہے۔

فریضہ شہادت علی الناس ـــــ قرآن حکیم کی روشنی میں

قرآن مجید میں ''شہید'' درحقیقت گواہ کے معنی میں آتا ہے۔دنیا کی زندگی میں یہ

گواہی دعوت وتبلیغ اور عملی شہادت کے ذریعے سے ہے۔ اور یہی لوگ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں استغاثہ کے گواہ (Prosecution Witness) کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے کہ اے اللہ! ہم نے تیرا پیغام انہیں پہنچا دیا تھا۔ قرآن مجید میں اہم مضامین دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔ چنانچہ یہ مضمون بھی دو مرتبہ آیا ہے کہ حضور ﷺ تم پر گواہی دیں گے اور تم بقیہ لوگوں پر گواہی دو گے کہ اے اللہ! تیرے نبیؐ نے تیرا جو پیغام ہم تک پہنچایا تھا' وہ ہم نے انہیں پہنچا دیا تھا۔ سورۃ الحج کی آخری آیت میں ارشاد ہوا ہے:

﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ ۚ﴾ (الحج: ۷۸)

''اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے' اس نے تمہیں چن لیا ہے' (حق کی پاسبانی اور اشاعت کے لئے) اور نہیں روا رکھی اس نے تم پر دین کے معاملہ میں کوئی تنگی۔ پیروی کرو اپنے باپ ابراہیم کے دین کی۔ اللہ نے تمہارا نام مسلم (سرِ اطاعت خم کرنے والا) رکھا ہے اس سے پہلے' اور اس قرآن میں بھی (تمہارا یہی نام ہے)' تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم بقیہ نوعِ انسانی پر گواہ بنو!''

سورۃ الحج اور سورۃ البقرۃ اس اعتبار سے ایک دوسری کے ساتھ منسلک ہیں کہ ہجرت سے متصلاً قبل سورۃ الحج اور ہجرت کے فوراً بعد سورۃ البقرۃ نازل ہوئی ہے۔ یہی مضمون سورۃ البقرۃ میں بھی بایں الفاظ آیا ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ﴾ (آیت ۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تم کو اُمت وسط بنایا ہے' تاکہ تم لوگوں پر بطورِ گواہ کھڑے ہو اور رسول تم پر بطورِ گواہ کھڑا ہو۔''

اس گواہی کا تعلق دنیا سے بھی ہے اور آخرت سے بھی۔ یہاں پر آخرت کو خاص طور پر نمایاں نہیں کیا گیا' لیکن وہ اس میں implied ہے۔ دنیا میں تم گواہی دو گے دعوت وتبلیغ اور اتمامِ حجت کے ذریعے اور قیامت کے دن اسی گواہی کا ظہور ہو جائے گا جبکہ تم اللہ کی عدالت میں کھڑے ہو کر گواہی دو گے۔ تو یہ مضمون بھی قرآن مجید میں دو جگہ آیا ہے۔ ایک سورۃ النحل میں' جو

ہجرت سے متصلاً قبل نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔ سورۃ النحل کی آیت ۸۹ میں ہے:

﴿وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ﴾

''اور اس دن (کا تصور کیجئے اے نبیؐ!) جس دن ہم ہر امت میں سے ایک گروہ گواہ بنا کر کھڑا کریں گے ان ہی میں سے' اور آپؐ کو گواہ بنا کر کھڑا کریں گے اِن (اہل عرب) پر''۔

اس ضمن میں دوسرا مقام سورۃ النساء آیت ۴۱ ہے' جس کا ذکر گزشتہ نشست میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث کے حوالے سے ہو چکا ہے۔ وہاں فرمایا:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ (النساء: ٤١)

پھر اُس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور آپ کو بھی (اے محمد ﷺ!) ان لوگوں کے خلاف بطور گواہ کھڑا کریں گے''۔

نوٹ کیجئے ''عَلٰی'' کا صلہ مخالفت کے لئے آتا ہے۔ یعنی وہاں گواہی ان کے خلاف پڑے گی۔ اس لئے کہ اگر کوئی قوم اس پوزیشن میں ہو کہ یہ کہہ سکے کہ اے اللہ! تیرا پیغام ہم تک تو آیا ہی نہیں' تو اس چیز کا انہیں اللہ کے ہاں کریڈٹ ملے گا اور انہیں رعایت دی جائے گی۔ ''Ignorance of law is no excuse'' دنیا کا قاعدہ ہے جبکہ اللہ کے ہاں ان لوگوں کو رعایت ملے گی جن تک بات نہیں پہنچی اور اُن کا جرم اِن کے کھاتے میں جمع ہوگا جن کے ذمہ تھا کہ پہنچائیں لیکن انہوں نے نہیں پہنچایا۔ بہر حال جن لوگوں تک بات نہیں پہنچی ان کے لئے تو وہ عذر ہو گیا' لیکن جن تک بات پہنچا دی گئی ان کے لئے کوئی عذر باقی نہیں۔ سورۃ النساء میں ارشاد ہوا: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا﴾ (آیت ۱۶۵) ''ہم نے اپنے رسولوں کو مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا تاکہ رسولوں کے آنے کے بعد کوئی عذر باقی نہ رہ جائے لوگوں کے حق میں اللہ کے (محاسبہ کے) خلاف''۔ تاکہ وہ یہ عذر نہ پیش کر سکیں کہ اے اللہ! تو ہم سے کس بات کا حساب لے رہا ہے' ہم تک تو تیرا پیغام پہنچا ہی نہیں۔

اس بات کو ایک سادہ ترین مثال سے سمجھئے! آپ کسی شخص کے ذریعے سے اپنے کسی دوست اور عزیز کو اپنا پیغام بھیجتے ہیں کہ فلاں کام کل شام تک ضرور ہو جانا چاہئے ورنہ میرا

بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ فرض کیجئے وہ کام نہیں ہوا۔ اب آپ غصے میں بھرے ہوئے اس دوست یا عزیز کے پاس جائیں گے جس تک آپ نے اپنا پیغام بھجوایا تھا اور اس سے کہیں گے کہ میں نے آپ تک یہ پیغام بھیجا تھا' آپ نے میرا وہ کام نہیں کیا اور مجھے اتنا بڑا نقصان ہو گیا' اس کا کون ذمہ دار ہے؟ اب اگر وہ صرف ایک جملہ کہہ دے کہ بھائی مجھے تو آپ کا پیغام ملا ہی نہیں' تو اس صورت میں آپ کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا' آپ اس سے شکوہ نہیں کر سکیں گے اور اب آپ کا سارا غصہ پیغام بر کی طرف جائے گا۔ آپ جا کر اس کی گردن ناپیں گے کہ اللہ کے بندے! میں نے تجھے اتنا اہم پیغام دے کر بھیجا تھا' تم نے میرا پیغام کیوں نہیں پہنچایا؟ تو اگر پیغام بر نے پیغام پہنچا دیا تو وہ بری ہو گیا' اب ساری ذمہ داری اس کی ہے جسے پیغام پہنچ گیا' لیکن اگر پیغام بر نے پیغام پہنچانے میں کمی کی ہے تو ساری ذمہ داری پیغام بر کی ہے اور جس کے پاس پیغام پہنچنا تھا اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ سورۃ الاعراف میں فرمایا: ﴿فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۞﴾ ''ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے ان سے بھی جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا اور ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے رسولوں سے بھی۔'' ہم رسولوں سے بھی پوچھ گچھ کریں گے کہ تم نے ہمارا پیغام پہنچا دیا تھا یا نہیں۔ وہ کہیں گے اے اللہ! ہم نے پہنچا دیا تھا اور ہم نے فریضہ رسالت کی ادائیگی پر لوگوں سے گواہی بھی لے لی تھی۔ خطبۃ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا: ((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟)) ''لوگو! کیا میں نے تم تک اللہ کا پیغام پہنچا دیا ہے؟'' اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یک زبان ہو کر کہا: ''اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَاَدَّيْتَ الْاَمَانَةَ وَنَصَحْتَ الْاُمَّةَ وَكَشَفْتَ الْغُمَّةَ'' ''ہم گواہ ہیں (اے اللہ کے رسولؐ!) آپ نے یقیناً فرض رسالت ادا کر دیا' اور امانت کا حق ادا کر دیا' اور امت کی نصیحت کی ذمہ داری ادا کر دی اور آپ نے (گمراہی کے) تمام اندھیروں کو زائل کر دیا''۔ تو اللہ کے رسول اپنی اپنی ذمہ داریوں سے بری ہو جائیں گے' اب ساری ذمہ داری ان کی ہو گی جن تک اللہ کا پیغام پہنچ گیا ہو گا۔ یہ ہے اصل میں شہادت!

صدیقیت وشہادت کے مراتب کھلے ہیں

ظاہر بات ہے کہ اہل ایمان میں بھی مختلف قسم کی شخصیتیں ہیں۔ کچھ لوگ اگر دروں بیں قسم کے ہیں' یعنی غور و فکر کرنے والے' سوچ بچار کرنے والے' سلیم الفطرت' رقیق القلب لوگ ہیں تو وہ صدیقیت کے مقام پر جا پہنچیں گے اور جن کا مزاج ایسا نہیں ہے وہ کم سے کم

شہادت کے مرتبے تک پہنچ جائیں گے۔ یہ دونوں راستے ان لوگوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے باطن سے مال کی محبت کا بریک کھول دیا ہے۔ لیکن اگر یہ بریک لگا ہوا ہے تو وہ آگے بڑھ ہی نہیں سکتے' ان کے لئے کوئی ترفع اور ترقی نہیں ہے' وہ تو بس نام کے مسلمان ہیں جو جیسے بھی ہیں چل رہے ہیں۔ لیکن اگر کسی نے دل سے مال کی محبت کو کھرچ دیا ہو اور پھر اللہ پر ایمان لایا ہو تو وہ مرتبہ صدیقیت پر فائز ہو سکتا ہے۔ اس کی تفصیل سورۃ الحدید کی آیت ۱۸ اور ۱۹ میں ہے۔

البتہ اس میں یہ مغالطہ ہرگز نہ آنے پائے کہ جس شخص کو نبیؐ کی دعوت براہِ راست پہنچی ہو اور اس نے اس پر لبیک کہا ہو صرف وہی مرتبہ صدیقیت پر فائز ہو سکتا ہے۔ بلکہ ہم میں سے بھی ہر شخص یہ رتبۂ خاص حاصل کر سکتا ہے۔ ہم نسلی طور پر مسلمان ہیں' عقیدتاً ایمان ہمارے پاس ہے' لیکن شعوری ایمان نہیں ہے۔ تو آج بھی ہم اس کی تحصیل کر سکتے ہیں۔ تجدید ایمان اسی کا نام ہے۔ ہر گناہ کے بعد جب انسان توبہ کرتا ہے تو وہ تجدید ایمان ہے۔ سورۃ الفرقان کا آخری رکوع ہمارے اس منتخب نصاب کے حصہ سوم میں شامل ہے۔ اس میں آیات ۶۸ تا ۷۰ میں توبہ کا مضمون بڑے خوبصورت انداز میں آیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۝ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۝ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝﴾

''(رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے' اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق قتل نہیں کرتے اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ کام جو کوئی کرے گا وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا۔ قیامت کے دن اس کا عذاب دوگنا کر دیا جائے گا اور وہ اس میں ہمیشہ ذلت کے ساتھ پڑا رہے گا۔ الاّ یہ کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو تو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا' اور وہ بڑا غفور رحیم ہے۔''

درحقیقت تجدید ایمان' توبہ اور تجدید عہد ہم معنی الفاظ ہیں [1]۔ بہرحال آج بھی مرتبۂ

---

(۱) یہ تین الفاظ ہم نے تنظیم اسلامی کی دعوت کی بنیاد کو واضح کرنے کے لئے اختیار کئے تھے اور ہماری بہت سی مطبوعات پر یہ بلاک شائع ہوتا ہے: ''تنظیم اسلامی کی اساسی دعوت: تجدید ایمان' توبہ اور تجدید عہد''۔

صدیقیت تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہے۔ یہ جان لیجئے نبوت کا دروازہ بند ہے' پہلے بھی وہ وہبی تھی' کسبی نہیں تھی' لیکن اب تو اس کا دروازہ مستقلاً بند ہے' البتہ ''صدیقیت'' اور ''شہادت'' کے مراتب کھلے ہیں۔ افتادِ طبع کے اعتبار سے انسان ترقی کر کے ان مراتب عالیہ کی تحصیل کر سکتا ہے۔ اور صالحین کا درجہ تو base line کی حیثیت رکھتا ہے۔ تو ان دونوں آیات (الحدید: ۱۸'۱۹) کے ربط سے واضح ہوا کہ جو لوگ اس مشکل گھاٹی کو عبور کر جائیں' یعنی مال کی محبت سے نجات حاصل کر لیں اور پھر ایمان کے زیور سے آراستہ ہوں تو اُن کے لئے مرتبۂ صدیقیت یا مرتبۂ شہادت تک رسائی حاصل کرنے کا راستہ کھلا ہے۔

ولایت اور نبوت کا باہمی تعلق

اس سلسلے میں چند اور باتیں وضاحت طلب ہیں۔ ہمارے تصوف کے حلقوں میں عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ ''ولایت'' ''نبوت'' سے افضل ہے۔ ظاہر کے اعتبار سے یہ بات بالکل غلط ہے' البتہ اس کے اندر بھی حقیقت کا ایک عنصر ہے' اگرچہ اصطلاحات غلط استعمال ہو رہی ہیں۔ ان کے ہاں دو نسبتیں ''نسبتِ ولایت'' اور ''نسبت نبوت'' مستقلاً مذکور ہیں۔ دراصل مقامِ نبوت ولایت' خلت' صدیقیت سب سے بلند ترین مقام ہے۔ لغوی اعتبار سے نبوت کی اصل یا تو ''نَبَأٌ'' ہے' جس سے ''نبی'' کا مفہوم ہے ''خبر دینے والا'' اور یا پھر ''نَبُوٌ'' ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ تو اس سے اُونچا کوئی مقام نہیں ہے۔ یہ بھی جان لینا چاہئے کہ رسالت' نبوت کے ساتھ منتھی ہے اور نبوت رسالت سے افضل ہے۔ عام طور پر ہمارا تصور یہ ہے کہ رسالت نبوت سے افضل ہے۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ رسالت مقامِ نزول میں ہے اور نبوت مقامِ عروج میں ہے۔ اصل حیثیت مقامِ نبوت کی ہے' لیکن جب کسی نبی کو کسی معین جگہ پر بھیجا جاتا ہے تو اسے رسول بنا کر بھیجا جاتا ہے' جیسے حضرت لوط علیہ السلام کو سدوم اور عامورہ کی بستیوں کو خبردار کرنے کے لئے بھیجا گیا' حضرت ہود علیہ السلام کو قومِ عاد کی طرف بھیجا گیا' حضرت صالح علیہ السلام کو قومِ ثمود کی طرف بھیجا گیا' موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور آلِ فرعون کی طرف معین کر کے بھیجا گیا۔ تو یہ رسالت دراصل ''مقامِ نزول'' ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ نبوت رسالت سے افضل ہے۔

نبوت کا رشتہ درحقیقت ولایت' خُلت اور صدیقیت سے ہے۔ اور وہ کس اعتبار سے ہے' اسے جان لینا ضروری ہے۔ یہ بڑے اہم مضامین ہیں۔ یہ بات پوری اُمت کے نزدیک

متفق علیہ ہے کہ نبوت عام ہے اور رسالت خاص ہے۔ یعنی ہر رسول تو لازماً نبی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں ہے۔ انہی چیزوں کی وجہ سے یہ تصور ذہن میں قائم ہو گیا کہ رسالت نبوت سے افضل ہے۔ لیکن درحقیقت یہ افضل نہیں ہے' بلکہ ان میں خاص اور عام کی نسبت ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نبی تھے' لیکن رسول نہیں تھے۔ انہوں نے نہ تو اپنے آپ کو ماننے کی دعوت دی اور نہ کوئی مطالبہ کیا کہ مجھ پر ایمان لاؤ۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہِ مصر کے خواب کی درست تعبیر بتائی' جس کی بنا پر وہ جیل سے رہا ہوئے' اور پھر انہوں نے اس قوم کو قحط سے بچنے کی تدبیر بتائی جو اُن پر آنے والا تھا تو شاہِ مصر نے آپؑ کو وزارتِ مالیات جیسا بڑا عہدہ پیش کیا' جسے آپؑ نے قبول کر لیا' لیکن بادشاہ تو بہرحال وہی شخص تھا۔ قرآن مجید سے اس کے ایمان کا ثبوت بھی نہیں ملتا' البتہ وہ نیک انسان تھا۔ جیل کے لوگوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ''صدیق'' کہہ کر پکارا تھا کہ: ﴿یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ﴾ ''یوسف' اے صدیق!''

نبی اپنی ذاتی شخصیت کے اندر ولایت کے درجے پر فائز ہوتا ہے۔ اور جب اس پر اللہ کی طرف سے وحی اترتی ہے تو اسے نبوت سے سرفراز کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے آج کل کے قلندر قسم کے لوگوں سے قطع نظر' جو شخص واقعتاً اللہ کا دوست' خلیل' وفادار اور مخلص ہے' اس پر اگر وحی آ جائے تو وہ نبی ہے' اور اگر وحی نہیں ہے تو وہ بس اللہ کا ولی اور برگزیدہ ہے۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ اور حضرت یوسف علیہ السلام میں یہی تو فرق ہے کہ حضرت یوسفؑ پر وحیٔ نبوت نازل ہوئی۔ ورنہ شخصیت کے اجزائے ترکیبی جو عبدالقادر جیلانیؒ کے ہیں وہی حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہیں۔ نبی سیرت و کردار کے حوالے سے ایک مکمل انسان ہوتا ہے' وہ لوگوں کو حق کی طرف دعوت بھی دے رہا ہوتا ہے' لیکن وہ اللہ کی طرف سے اس طرح سے مامور ہو کر نہیں آیا ہوتا کہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور میری اطاعت قبول کرو۔ جبکہ رسول تو لوگوں سے جا کر کہتا تھا کہ اللہ کی بندگی کرو اور میرا حکم مانو' میری اطاعت کرو' مجھے ماننا پڑے گا! سورۃ الشعراء میں تمام رسولوں کی یہی دعوت نقل ہوئی ہے کہ: ﴿اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۞ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ۞﴾ ''یقیناً میں تمہاری طرف ایک رسولِ امین (مبعوث ہوا) ہوں' پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو!'' تو یہ رسالت ہے۔

نبوت اور رسالت کا فرق

نبوت اور رسالت کا فرق Simultaneous Contrast کے اعتبار سے حضرت

یحییٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) کے تذکرہ میں بہت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ حضرات یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کا دَور ایک ہی ہے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام صرف نبی تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول تھے۔ دو سورتوں سورۂ مریم اور سورۂ آل عمران میں اِن دونوں حضرات کا تقابل وارد ہوا ہے۔ سورۂ آل عمران میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی مدح اور ان کی شخصیت اور سیرت و کردار کے بارے میں بہت سے تاریخی کلمات کے بعد آخر میں یہ بات کہی گئی: ﴿وَنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ ''وہ نبی ہے صالحین میں سے''۔ نوٹ کیجئے مرتبۂ صالحیت base line ہے اور انسان اسی سے عروج حاصل کرتے ہوئے نبوت تک پہنچتا ہے۔ جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے: ﴿وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ ''اور وہ رسول تھے بنی اسرائیل کی طرف''۔ یہی وجہ ہے کہ چونکہ نبی قتل بھی ہو سکتا ہے اس لئے حضرت یحییٰ علیہ السلام قتل کر دیئے گئے۔ جابر شاہِ وقت نے ایک رقاصہ کی فرمائش پر جلاد کے ذریعے آپؑ کا سر قلم کروایا اور طشت میں رکھ کر اُس رقاصہ کو پیش کر دیا۔ قرآن کریم آپؑ کے سیرت و کردار کا ذکر ان الفاظ میں کر رہا ہے:

﴿يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ۝ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝﴾ (مریم: ۱۲ تا ۱۴)

''اے یحییٰ! کتابِ الٰہی کو مضبوطی سے تھام لے۔ ہم نے اسے بچپن ہی میں حکم سے نوازا' اور اپنی طرف سے اس کو نرم دلی اور پاکیزگی عطا کی' اور وہ بڑا پرہیزگار اور والدین کا حق شناس تھا' اور وہ جبار نہ تھا اور نہ نافرمان۔''

دیکھئے قرآن میں آپؑ کی یہ عظمت بیان ہو رہی ہے' لیکن دنیا میں یہ حال سامنے آ رہا ہے کہ ایک آبرو باختہ عورت کی فرمائش پر قتل کر دیئے گئے۔ دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ اللہ کے رسول تھے' اللہ کی طرف سے مقرر کردہ تھے لہٰذا قتل نہیں کئے گئے' اس لئے کہ رسول قتل نہیں کیا جا سکتا۔

ان دونوں مراتب ''نبوت و رسالت'' کو ایک مثال سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ ہمارے یہاں CSP ایک کاڈر (cadre) ہے۔ وہ CSP اگر کہیں جا کر ڈپٹی کمشنر لگ گیا ہے تو یہ اس کی تقرری (appointment) ہے۔ اسی طرح جب کوئی صرف نبی ہے تو گویا نبی کی حیثیت سے اس کا ایک کاڈر معین ہو گیا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے بہت سے CSP

حضرات کی تقرری نہیں ہو پاتی۔ جو شخص سرکاری یونیفارم میں نہیں ہے اس کے خلاف اقدام عام سی بات شمار ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص فوجی یونیفارم میں ملبوس ہے تو گویا وہ حکومت کا نمائندہ ہے اور اس کے خلاف اقدام کرنا حکومت کو چیلنج کرنا ہے۔ بعینہٖ جب نبی مامور من اللہ ہو کر کسی قوم کی طرف بھیج دیئے جاتے تھے تو وہ اللہ کی نمائندگی کر رہے ہوتے تھے اور ان کو قتل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا رسولوں کے بارے میں یہ وعدہ ہے: ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ﴾ (المجادلہ:۲۱) ''اللہ نے یہ لکھا ہوا ہے (طے کیا ہوا ہے) کہ میں اور میرے رسول غالب آ کر رہیں گے''۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جب اللہ تعالیٰ سے فریاد کی تھی: ﴿اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ﴾ ''(پروردگار!) میں تو مغلوب ہوا جا رہا ہوں' پس میری مدد کیجئے!'' ان سے انتقام لیجئے! تو اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کو رہتی دنیا تک کے لئے نشانِ عبرت بنا دیا۔ اس لئے کہ رسول کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت اور فتح یابی لازم ہے۔ اور اگر قوم نے بحیثیت مجموعی رسول کی دعوت کو رد کر دیا ہو تو قوم کا ہلاک کیا جانا لازم ہے۔ جیسے قومِ نوحؑ' قومِ لوطؑ' قومِ صالحؑ' قومِ شعیبؑ اور آلِ فرعون انکارِ رسالت کی پاداش میں ہلاک کر دیئے گئے' بلکہ صفحۂ ہستی سے مٹا دیئے گئے۔ لیکن نبی کے انکار کے جرم میں دنیا میں ہلاکت لازم نہیں ہے' اس کا حساب کتاب آخرت میں جا کر ہوگا' اس لئے کہ اللہ کی طرف سے اس کی تقرری نہیں ہوئی۔ وہ تو یوں سمجھئے کہ ایک ولی اللہ ہے جس کے پاس اللہ کی طرف سے وحی آ رہی ہے۔ تو درحقیقت نبوت و رسالت کا یہ فرق ہے اور اس کو سمجھنے ہی سے سارے عقدے حل ہوتے ہیں۔

مقامِ صدیقیت کے اجزائے ترکیبی

مقامِ صدیقیت کے اجزائے ترکیبی کی قدرے وضاحت مفید طلب ہے۔ مقامِ صدیقیت کے یہ اجزائے ترکیبی سورۃ اللیل میں Simultaneous Contrast کے اعتبار سے بیان ہوئے ہیں۔[1] اس سورۂ مبارکہ میں تین اوصافِ حمیدہ مقامِ صدیقیت پر فائز شخصیت کے بیان ہوئے ہیں اور تین ہی اوصافِ رذیلہ اس کے برعکس شخصیت کے بیان ہوئے ہیں۔ فرمایا:

﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۞ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۞ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۞ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۞﴾

(۱) یہ ''شہید مظلوم'' کے نام سے ایک کتابچہ موجود ہے جس میں بنیادی طور پر یہ مضامین آ گئے ہیں۔

''گواہ ہے رات جبکہ وہ ڈھانپ لیتی ہے' اور (گواہ ہے) دن جبکہ وہ روشن ہو جاتا ہے' اور وہ نر اور مادہ جو اللہ نے تخلیق کیا۔ یقیناً (اے لوگو!) تمہاری کوششیں بھی مختلف قسم کی ہیں''۔

پہلے تو اللہ تعالیٰ نے قسموں کی صورت میں استشہاد کیا ہے کہ اے لوگو! جیسے رات کی تاریکی اور دن کی روشنی میں اور نر اور مادہ (اور مرد و عورت) میں فرق و تفاوت ہے' اسی طرح تمہاری کوششوں اور سعی و جہد میں اور تمہارے انجام میں بھی فرق و تفاوت ہے۔ آگے وہ صفات بیان کی جا رہی ہیں:

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ۞ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ۞ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی ۞ وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی ۞ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ۞ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی ۞﴾

''تو جس نے (اللہ کی راہ میں) مال دیا اور (اللہ کی نافرمانی سے) پرہیز کیا' اور بھلائی کو سچ مانا' اس کو ہم آسان راستے کے لئے سہولت دیں گے۔ اور جس نے بخل کیا اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا' اس کو ہم سخت راستے کے لئے سہولت دیں گے''۔

صدیق کا پہلا وصف یہ ہے کہ اس میں عطا اور جُود و سخاوت ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کی مشکلات کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اور ان کی مدد کرتا ہے' بھوکوں کو کھانا کھلاتا ہے۔ دوسرا وصف یہ ہے کہ اس کے اندر تقویٰ ہوتا ہے۔ وہ کسی کا دل نہیں دکھانا چاہتا' کسی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا' کسی پر دست درازی اور تعدی نہیں کرنا چاہتا۔ اور تیسرا وصف یہ کہ وہ ہر اچھی بات کی تصدیق کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اس کے اندر تعصب نہیں ہوتا' عصبیت' ضد اور ہٹ دھرمی نہیں ہوتی۔ اس کے سامنے جب کوئی ایسی بات آتی ہے کہ اس کا دل گواہی دے کہ بات صحیح ہے تو اسے فوراً تسلیم کر لیتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ دوسرے کی بات مان لینے سے اس کی جیت اور میری ہار ہو جائے گی۔ ہونا بھی یہی چاہئے کہ صحیح اور حق بات جس کی صحت پر دل بھی گواہی دے رہا ہو' فوراً قبول کر لی جائے۔ تو جس شخص میں یہ تین اوصاف جمع ہو جائیں تو وہ مقام صدیقیت پر فائز ہے۔ جیسے اقبال نے کہا ع ''یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان''۔ امام رازیؒ نے اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ سورتِ صدیق اکبر ہے' یعنی حضرت ابوبکر صدیق ﷺ کی سورت ہے۔ اس لئے کہ اِس اُمت میں سب سے

زیادہ متقی شخص وہی ہیں' جن میں یہ تینوں اوصاف بتمام وکمال جمع ہو گئے تھے۔

اس کے برعکس جو شخص اِن تینوں اوصاف سے خالی ہو وہ بدترین مخلوق ہے۔ اُس میں صفتِ عطا کے برعکس بخل' اور تقویٰ کے برعکس اللہ سے استغناء اور بے پروائی ہوتی ہے۔ اسے حلال وحرام کی فکر ہی نہیں ہوتی۔ اس کا جہاں ہاتھ پڑتا ہے' حلال وحرام سے بے نیاز ہو کر اسے حاصل کر لیتا ہے۔ جس کا چاہتا ہے استحصال اور حق تلفی کرتا ہے' جس پر چاہتا ہے ظلم کرتا ہے' جس کا دل چاہتا ہے دکھاتا ہے اور جس کی عزت پر چاہے حملہ کرتا ہے۔ یہ استغناء اور بے نیازی ہے۔ تیسرے درجے میں وہ صحیح وعمدہ بات اور سچائی وصداقت کی تکذیب کرتا ہے۔ اس شخص کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے: ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى﴾ ''تو ہم رفتہ رفتہ اسے العُسریٰ (تنگی) تک پہنچا دیں گے''۔ یعنی جہنم تک' جو بڑی تنگی اور سختی کی جگہ ہے۔ تو لفظ ''شہادت'' منصب رسالت کے لئے۔ اور جو لوگ اللہ کے پیغام کو پہنچاتے ہیں اور اس کے دین کو قائم کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں وہ درحقیقت شہداء ہیں۔

حضرات ابراہیم اور ادریس علیہما السلام کی شخصیات کے مطالعے سے بھی اس عقدے کو حل کرنے میں راہ نمائی ملتی ہے۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے تفصیلی حالات تو ہم نہیں جانتے' قرآن مجید میں اُن کا بس اتنا تذکرہ ہے کہ: ﴿وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا﴾ ''اور ہم نے انہیں بھی بہت اونچا مقام ومرتبہ عطا فرمایا''۔ یہ غالباً حضرت نوح اور حضرت آدم علیہما السلام کے مابین کی شخصیت ہیں۔ جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تفصیلی حالات ہمیں معلوم ہیں۔ آپؑ سلیم الفطرت انسان تھے۔ شروع ہی سے سوچ بچار اور غور وفکر کی خو تھی۔ وہ سوچتے تھے کہ ان سورج' چاند اور ستاروں کا کیا مقام ہے جن کو پوجا جا رہا ہے! مظاہر فطرت اور ان کی تخلیق پر غور وفکر کرتے کرتے وہ توحید تک پہنچ گئے اور بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا: ﴿اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ ''میں نے یک سو ہو کر اپنا رُخ اُس ہستی کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا اور (اے پروردگار!) میں شرک کرنے والوں میں نہیں ہوں''۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت ہے۔ اسی لئے ان کو کہا گیا: ﴿صِدِّيْقًا نَّبِيًّا﴾ یعنی آپ صدیق نبی تھے۔ آپ نبوت عطا ہونے سے پہلے مقامِ صدیقیت پر فائز ہیں' جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھنے والے صدیق کہہ رہے ہیں۔ ﴿يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ﴾۔

یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ چونکہ نبوت عورتوں کو نہیں دی گئی ـــــ اس لئے کہ یہ بہت

بھاری ذمہ داری ہے ـــــ لہٰذا خواتین کے لئے سب سے اونچا مقام صدیقیت ہے۔ حضرت مریم سلام علیہا کے بارے میں قرآن کہتا ہے: ﴿اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ﴾ ''ان (حضرت عیسیٰؑ) کی والدہ (حضرت مریمؑ) صِدّیقہ تھیں''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صفتِ شہید سے متصف تھے۔ آپؑ بہت قوی الجثہ انسان تھے۔ ان کی طاقت کی کیفیت یہ تھی کہ قبطی کو بس ایک تھپڑ یا گھونسا رسید کر کے اس کی جان نکال دی۔ قرآن مجید میں اُن کے بارے میں سوچ بچار کی کوئی روداد نہیں آئی۔ وہ تو رات کے وقت بیوی بچوں سمیت وطن واپس آ رہے تھے 'جبکہ شدید سردی اور اندھیرا تھا' دُور سے کہیں آگ نظر آئی' خیال گزرا کہ شاید کوئی کٹیا ہے جہاں سے راستہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ گھر والوں سے فرمایا کہ تم یہاں ٹھہرو' میں وہاں سے آگ کی چنگاری لے کر آتا ہوں تا کہ تم لوگ آگ تاپ سکو۔ (قرآن مجید میں ''بِشِهَابٍ قَبَسٍ'' ''یا'' ''جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ'' کے الفاظ ہیں) لیکن وہاں اللہ تعالیٰ نے نبوت سونپ دی۔ گویا گئے تھے آگ لینے کو' مل گئی نبوت۔ جبکہ کہاں محمد رسول اللہ ﷺ کا معاملہ ہے کہ آپؐ غارِ حرا کے اندر جا کر بیٹھتے اور کئی کئی دن متواتر غور و فکر کرتے۔ روایات میں الفاظ ملتے ہیں: ''كَانَ صِفَةُ تَعَبُّدِهٖ فِيْ غَارِ حِرَاءَ التَّفَكُّرُ وَالْاِعْتِبَارُ'' ''غارِ حراء میں آپ ﷺ کی بندگی غور و فکر اور عبرت حاصل کرنا تھی''۔ ان دونوں شخصیات کی سیرت کے مطالعہ سے ان کے مابین فرق نمایاں ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا: ﴿رَسُوْلًا نَّبِيًّا﴾ ''آپ رسول نبی تھے''۔ یہاں رسول ''شہید'' کے معنی میں ہے۔ ان دونوں الفاظ (رسالت اور شہادت) میں بڑی گہری مناسبت ہے۔ آپ علیہ السلام مزاجاً شہداء میں سے ہیں اور شہادت سے ہو کر نبوت تک پہنچے ہیں' یعنی صالحیت و شہادت سے ہو کر رسالت اور پھر نبوت۔ اسی لئے آپؑ کو ''رَسُوْلًا نَّبِيًّا'' کہا گیا ہے۔

یہی معاملہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا بھی ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شخصیت کے بارے میں بھی کتبِ سیرت میں وہی واقعات ملتے ہیں جو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہیں۔ دو مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین سے چل کر اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ملنے آئے لیکن آپؑ شکار کے لئے نکلے ہوئے تھے۔ اُن کے گھر میں دو دن مقیم رہنے کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اُن سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ حضرت اسماعیلؑ کی بیوی نے ان کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کچھ شکوہ

کیا کہ ہمارے حالات اچھے نہیں ہیں' بڑی تنگی ہے' تو آپؐ جاتے ہوئے کہہ گئے کہ جب میرے بیٹے آئیں تو ان سے کہہ دینا گھر کی چوکھٹ بدل دیں۔ (یعنی وہ بیوی کہ جو شاکی ہے وہ اس لائق نہیں ہے کہ تیرے گھر میں رہے) وہ واپس آئے تو انہیں بیوی نے پیغام دیا اور آپؑ نے اپنے والد محترم کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بیوی کو طلاق دے دی۔ تو حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت اور حضرت اسماعیلؑ کی شخصیت کے مابین یہی نمایاں فرق ہے۔ اس لئے انہیں ﴿رَسُوْلًا نَّبِیًّا﴾ کہا گیا ہے۔

قرآن مجید میں دو رسولوں کے لئے ﴿صِدِّیْقًا نَّبِیًّا﴾ آیا ہے اور دو کے لئے ﴿رَسُوْلًا نَّبِیًّا﴾ لیکن ہمارے مفسرین کی بے توجہی کا عالم یہ ہے کہ کسی نے بھی ان مقامات پر تدبر کی زحمت گوارا نہیں کی۔ میں نے عہد حاضر کے ایک بہت بڑے مفسر سے سوال کیا کہ قرآن مجید میں دو رسولوں کے بارے میں ''صِدِّیْقًا نَّبِیًّا'' کے الفاظ آئے ہیں اور دو کے بارے میں ''رَسُوْلًا نَّبِیًّا'' کے' اس میں کیا حکمت ہے؟ تو انہوں نے پوچھا واقعی کہیں ''رَسُوْلًا نَّبِیًّا'' آیا ہے؟ میں نے سورۂ مریم کی آیات پڑھ کر سنائیں کہ یہ وہ مقامات ہیں۔ اس کا سبب دراصل قلتِ تدبر ہے کہ آدمی بغیر توجہ کئے گزر جاتا ہے کہ 'رسول' کے بعد 'نبی' کا کیا مطلب ہو سکتا ہے' جبکہ رسالت تو نبوت کے بعد ملتی ہے۔ تو یہاں درحقیقت رسول شہید کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مختلف شخصیتوں کے مزاج مختلف ہوتے ہیں۔ ہماری اُمت میں ایک طرف حضرات ابوبکر و عثمان رضی اللہ عنہما ہیں جو صحابہ کرامؓ میں سب سے چوٹی کے صدیقین ہیں' دوسری طرف حضرات حمزہ اور عمر رضی اللہ عنہما ہیں جو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں شہداء کی بہت نمایاں مثال ہیں۔ جبکہ انبیاء و رسل میں سے حضرات ابراہیم اور ادریس علیہما السلام ''صِدِّیْقًا نَّبِیًّا'' ہیں اور موسیٰ اور اسماعیل علیہما السلام ''رَسُوْلًا نَّبِیًّا'' ہیں۔ یہ وہ حقائق ہیں جن کی قدرے وضاحت ضروری تھی۔

صدیقۂ کبریٰ کون؟

اس ضمن میں ایک بات مزید نوٹ کیجئے۔ مجموعی طور پر تو خواتین میں حضرت مریم سلام علیہا ''صدیقہ'' ہیں' سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا اس اُمت میں بھی کوئی صدیقہ ہے؟ دیکھئے عام طور پر تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ لفظ ''صِدّیقہ'' استعمال ہوتا ہے' لیکن درحقیقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عمر کے اعتبار سے دوسری نسل سے تعلق رکھتی ہیں' اگرچہ

آپ ﷺ کی زوجۂ محترمہ ہونے کی حیثیت سے اُمّ المومنین ہیں۔ جیسے حضرت علی اور ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم کے مراتب میں فرق وتفاوت ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرات ابوبکر وعمر وعثمان رضوان اللہ علیہم سے تقابل کرنا درحقیقت قیاس مع الفارق کے مترادف ہے۔ ان کی تو نوعیت ہی مختلف ہے۔ حضرات ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم حضور ﷺ کے تقریباً ہم عمر لوگوں میں سے ہیں۔ حضرت ابوبکر آپ ﷺ سے دو اڑھائی برس چھوٹے ہیں' حضرت عمر چھ برس اور حضرت عثمان پانچ برس چھوٹے ہیں۔ یہ تو آپؐ کے برابر کے ہیں اور آپ ﷺ کے ساتھی اور دست وبازو ہیں۔ کسی قبیلے یا قوم کے اندر ایسے لوگ ''مَـــلَأ'' کہلاتے ہیں اور پٹھانوں کے ہاں ''مشران'' کہلاتے ہیں۔ جبکہ حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ تو دوسری نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور حضور ﷺ کے مقابلے عمر کا بہت فرق وتفاوت ہے' اگرچہ اپنی شخصیت کے اعتبار سے بہت اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں۔ حضور ﷺ کے بعد صحابہ کرام میں ambivert حضرت علیؓ کی شخصیت ہے۔ تو جامعیت کے اعتبار سے اُن کا مقام اور ہے لیکن کمیت کے اعتبار سے حضرت علیؓ خلفاء ثلاثہ کے آس پاس بھی نہیں آتے' اگرچہ ترتیب میں چوتھے ہیں۔ تو بالکل اسی طرح کا معاملہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ہے۔ ان کا مقام بہت بلند ہے' فقہاء صحابہ میں سے ہیں' حضور ﷺ کی محبوب زوجۂ محترمہ ہیں' لیکن صدیقیتِ کبریٰ کے مقام پر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا فائز ہیں۔ اسی لئے ان کے نام کے ساتھ لفظ ''کبریٰ'' لگا ہوا ہے۔ جس طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے قدموں میں اپنی ساری دولت نچھاور کر دی اسی طرح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے بھی اپنی پوری دولت حضور ﷺ کے قدموں میں ڈال دی کہ جس طرح چاہیں اور جہاں چاہیں استعمال کیجئے۔ حضور اکرم ﷺ کی تصدیق میں جیسے حضرت ابوبکرؓ نے ایک لحظہ کا توقف بھی نہیں کیا ایسے ہی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے بھی لحظہ بھر کے توقف کے بغیر آپ کی تصدیق کی۔ بلکہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ حضور ﷺ پر پہلے ایمان لانے والے حضرت ابوبکرؓ ہیں یا حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ!۔ میں تو دعوے سے کہتا ہوں کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ہیں۔ اس لئے کہ غارِ حرا سے اتر کر حضور ﷺ پر جو خوف کی کیفیت تھی اور لرزہ طاری تھا' تو یہ پہلا تجربہ آپؐ نے اپنی زوجہ محترمہ کو ہی بتایا ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ آپ نے جا کر پہلے اپنے کسی دوست یا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بتایا ہو۔ بلکہ آپؐ زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِـــی کہتے ہوئے

(باقی صفحہ 64 پر)

مصارفِ زکوٰۃ

اور

عصرِ حاضر (اکیسویں صدی عیسوی) میں

مصالحِ اُمّتِ محمدیؐ

علماء کرام اور مفتیانِ عظام کے لئے دعوتِ فکر

تحریر: انجینئر مختار حسین فاروقی

تمہید:

زکوٰۃ کے مسئلے پر یہ تحریر دراصل اس ردّوقدح کا حصہ ہے جو اِس دَور میں زکوٰۃ کی ادائیگی اور اِس کے استعمال کے سلسلے میں دینی اور مذہبی اداروں میں لفظ ''فی سبیل اللہ'' کی تشریح میں پیدا ہوئی ہے۔ ضمناً اس گفتگو میں مسئلۂ تملیک جیسا اہم مسئلہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔

ذرا تفصیل سے دیکھیں تو قطع نظر اِس کے کہ دیگر دینی اداروں میں یہ بحث کہاں سے شروع ہو کر اب کس مرحلے میں ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کے معاملے میں اطمینانِ قلبی کے لئے کیا پیمانہ بنایا گیا ہے، انجمن خدام القرآن سندھ کراچی (رجسٹرڈ) میں زکوٰۃ کے استعمال سے متعلق دو ساتھیوں جناب راشد یار صاحب اور عمران صاحب نے اپنے عدمِ اطمینان کا اظہار کیا۔ سرپرست انجمن جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے افہام و تفہیم کی کوشش فرمائی مگر بات نتیجہ خیز نہ ہوئی۔

اس بحث و تمحیص میں دو تین سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔ چند دیگر اہل علم نے بھی اس سلسلے میں علماء اور اہل بصیرت کی آراء کے حوالے سے بیش قیمت معلومات دی ہیں، مگر تا حال

ہمارے دو مذکورہ ساتھیوں اور اُن جیسی سوچ کے حامل دیگر رفقاء واحباب کی تشفی نہیں ہو سکی' بلکہ اُن کے اضطراب میں اضافہ ہوا ہے اور ان ساتھیوں کی حالیہ (۷رفروری ۲۰۰۴ء کی) فراہم کردہ تحریروں میں تنظیم اسلامی کے لٹریچر اور بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تحریروں کے حوالوں سے اپنے موقف کو مزید مدلل ومؤکد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دریں صورتِ حال اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ مقصد کی وضاحت اور شریعت کا منشا سمجھنے کی مزید کوشش کی جائے' تاکہ حق واضح ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق کی طرف رہنمائی فرمائے اور اس پر چلنے اور ڈٹے رہنے کی توفیق بخشے۔ آمین!

یہ بات بھی یہیں آپ کے علم میں آ جائے تو اچھا ہے کہ راقم ہرگز اس بات کا مدعی نہیں کہ وہ اس قضیئے میں ثالث یا حتمی فیصلہ دینے کی حیثیت کا مالک ہے یا کوئی بیچ کا راستہ تلاش کرنے کا متمنی ہے کہ فریقین میں مصالحت کی کوئی شکل پیدا ہو جائے' بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ مسئلہ کی تنقیح کی جائے اور اس کے مختلف سماجی' معاشرتی' تاریخی اور شرعی پہلو بیک وقت سامنے رکھ دیئے جائیں تاکہ اہل علم ہر گوشے کو سامنے رکھ کر صحیح فیصلے تک پہنچ سکیں۔

ان سطور میں جو نقشہ حالات واحوال کا ماضی حال اور مستقبل کے بارے میں دائرہ تحریر میں لایا گیا ہے وہ کوئی جامع ومانع شے نہیں ہے' بلکہ اس ضمن میں ایک بھرپور کوشش ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں برکت ڈال دے' اسے موجب خیر بنائے' ہم سب کو حق پر جمع کر دے' اطمینانِ قلب کی دولت سے مالا مال کر دے اور اسی کا علمبردار بنائے۔ آمین!

خلاصۂ تحریر (Synopsis):

اس مضمون اور تحریر میں درج دلائل اور حاصلِ کلام کا ایک خلاصہ اس حصے میں درج کیا جا رہا ہے' تاکہ قاری کو پہلے سے اندازہ ہو جائے کہ اس تحریر میں دلائل اور گفتگو کا انداز پھیل کر کس نکتے پر دوبارہ سمٹنے والا ہے' تاکہ جو پڑھنے والا اس تحریر کو مزید پڑھنے سے دلچسپی رکھتا ہو وہی مزید وقت لگا کر اس طرزِ استدلال کو سمجھے اور صحیح اور غلط کا اندازہ کر سکے۔ اور جو قاری پہلے سے اپنی کسی رائے پر جازم ہے اور اس کے خلاف کچھ پڑھنے یا سننے پر تیار ہی نہیں ہے وہ یہیں رک جائے اور اپنا قیمتی وقت اور صلاحیتیں کسی اور اعلیٰ کام کے لئے محفوظ رکھے۔

راقم کے نزدیک اس مسئلے پر جو کچھ گفتگو اور ردّ وقدح حالیہ عرصے میں انجمن اور تنظیم کے پلیٹ فارم پر ہوئی ہے یا دیگر کتب اور فتاویٰ میں عام طور پر موجود ہے اس میں مختلف

اشخاص اور مفتی حضرات نے اس مسئلے پر مختلف النوع مخصوص حالات میں رائے دی ہے اور خلوص کے ساتھ ایک دوسرے سے اختلاف بھی کیا ہے۔ جدید اصطلاح میں اسے Different Planes پر بات کرنا کہتے ہیں' اور مختلف پس منظر میں دیئے گئے فتاویٰ کو گہرے غور وفکر کے بعد یکسر مختلف حالات پر منطبق کر دینا اہل علم کے شایانِ شان نہیں۔ ہماری منطق کی اصطلاح میں اسے قیاس مع الفارق یا خلط مبحث کا نام دیا جاتا ہے۔

ان سطور میں اس پس منظر اور صورتِ مسئلہ کی کافی حد تک وضاحت کی کوشش کی گئی ہے اور قرآن مجید اور حدیث مبارکہ کے دلائل کے ساتھ ساتھ اجماعِ اُمت کا بھی صحیح محل اور مقام سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

راقم کے نزدیک موجودہ ظروف و احوال میں ہمارے علمائے دینِ متین اور مفتیانِ عظام اگر حالات اور واقعات کا معروضی جائزہ لیں اور دین اسلام کی کیفیت' اعدائے اسلام کی سازشیں' اُن کے بے پناہ وسائل' فقراء اور مساکین کی کیفیات' تقاضے اور اس ضمن میں حکومتوں کی ذمہ داریاں اور زکوٰۃ (جیسے فرض) کی ادائیگی کے لئے مرکزی اجتماعی نظام کی عدم موجودگی جیسے دیگر ناگزیر پیش آمدہ حالات اور یکسر مختلف صورتِ حال کو پیش نظر رکھ کر صرف مفتیٰ بہ قول (اور وہ بھی ''مُلْکًا عَاضًّا'' کے دور کا) نقل کر کے بھیج دینے کو کافی نہ سمجھیں تو مجھے اللہ تعالیٰ سے پوری امید ہے کہ وہ بھی اسی رائے تک پہنچیں گے کہ موجودہ دَور کے دین سے دور عوام کے مسائل کو حکومتوں کے بے پناہ وسائل پر چھوڑ کر 'صدقات' کی اس آمدنی کو اسلام کی بقا اور نشاۃِ ثانیہ کے لئے کام کرنے والے اداروں اور اُن سے وابستہ اور ملحق افراد کی ضروریات کی کفالت تک محدود کر دینا چاہئے۔

اس تحریر کے ذریعے راقم نے اس بات کو مبرہن کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تو قارئین کرام اب آئندہ صفحات کا مطالعہ کر کے ہی فیصلہ کریں گے کہ اس مقصد میں کسی قدر کامیابی ہوئی بھی ہے یا نہیں۔ تاہم یہ عرض کئے بغیر چارہ نہیں کہ مقصود سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ؎

بیا تا کارِ ایں اُمت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم!

اور جب تک علمائے حق اس بات پر متفق نہ ہوں کہ غرباء اور مساکین عوام کے لئے تو شاید

امریکہ اور دجال کی طرف سے امداد آ جائے' اور آ رہی ہے' دین متین کی حفاظت اور احیائے دین کے لئے کوششیں جو بالآخر جہاد و قتال کے مرحلے میں داخل ہو کر اسلام کو ایک عالمی خلافت کی شکل دے سکتی ہیں' اس کے لئے یہی محدود وسائل اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و اعانت کے علاوہ کچھ بھی میسر نہیں۔

چناں نالیم اندر مسجد شہر
کہ دل در سینۂ ملا گدازیم

صورتِ مسئلہ:

صورتِ مسئلہ یا ان سطور میں زیر بحث نکتہ بنیادی طور پر صرف یہ ہے کہ زکوٰۃ جیسے اہم فریضہ کی ادائیگی کی نوعیت اور معاملات دورِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں کیا تھے؟ دورِ خلافت راشدہ میں کیا تھے؟ اور اس کے فوراً بعد جو دَور آیا جس میں دورِ بنو اُمیہ اور دورِ بنو عباس کا ابتدائی زمانہ شامل ہے' اس میں یہ معاملات اور ان پر اہل علم اور فقہائے اُمت کا نقطۂ نظر کیا تھا؟ کیا ان تینوں ادوار میں یہ معاملات ہو بہو ایک جیسے رہے یا ان میں مرورِ زمانہ سے کوئی تبدیلی آئی؟ مزید برآں آج جو حالات ہمارے سامنے ہیں کیا وہ دورِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے مشابہ ہیں یا دورِ خلافت سے مماثلت رکھتے ہیں یا بعد کے دَور جیسے ہیں' جس وقت پوری دُنیا پر عالم اسلام کا سکہ رواں تھا یا اس سے بھی مختلف ہیں؟ اگر فرق واقع ہوا ہے تو کہاں اور کتنا؟ اور اس کے نتیجے کے طور پر احکام زکوٰۃ کی تطبیق کیسے ہو؟

اس تغیر کی مثال یہ ہے کہ خیر القرون کے قریب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ مزارعت حرام ہے' تاہم چند عشروں کے فرق کے ساتھ حالات بدلے تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے مشروط مزارعت کے جواز کی رائے دی۔ ہم ظاہراً اسے اختلاف کا رنگ دیتے ہیں کہ شاگرد نے استاد سے صرف اختلاف کیا' حقیقتاً یہ ظروف و احوال کی تبدیلی کی وجہ سے اجتہاد کا نتیجہ تھا۔ اسی طرح حدیث میں تصریحاً ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد غازی فی سبیل اللہ ہے۔ فقہاء نے اس حدیث کو عموم پر قیاس کیا اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں غازی کے علاوہ دوسرے اشخاص کو بھی شامل کر دیا۔ یہ اجتہاد 'فی سبیل اللہ' کے لفظ میں عموم پر دلالت کرتا ہے کہ حالات کے بدلنے سے فی

سبیل اللہ کے معنی موقع اور محل کی مناسبت سے اسلام کی cause اور سربلندی کے لئے ہر مساعی کو لیا جانا چاہئے۔

ایک عمومی غلط تاثر:

ایک عمومی نقشہ جو آج کے عام دین دار اور مذہبی آدمی کے ذہن میں ہے وہ یہ کہ جیسے آج کل زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا نظام ہے' علماء کرام کے مدارس ہیں اور مشہور علمائے دین کی نسبت سے مختلف دارالعلوم ہیں' ان میں زکوٰۃ آ رہی ہے اور مدارس کے طلبہ واساتذہ پر خرچ ہوتی ہے' کچھ لوگ ذاتی طور پر ادا کرتے ہیں' کچھ 'سود' میں سے کاٹ کر حکومت وصول کر لیتی ہے اور پھر تقسیم کا ایک نظام بنا رکھا ہے' شاید دورِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام' دورِ خلافت راشدہ' دورِ بنو اُمیہ اور دورِ بنو عباس کے ابتدائی دور میں بھی ایسا ہی تھا۔ اور گویا کہ دین کے اس اہم شعبہ میں ضرورت اگر ہے تو صرف یہ کہ مزید لوگ اسی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی کریں تاکہ زیادہ سے زیادہ مدارس وجود میں آئیں اور اس سے طلبہ درسِ نظامی کی تعلیم حاصل کر کے نکلیں اور بس۔ اس تاثر کی رَو سے کچھ مغرب زدہ اور جدید ذہن کے لوگ اس کے مخالف ہیں اور اس مسلمہ اور متفقہ اور اسلاف سے چلی آ رہی صورتِ حال میں رخنہ ڈال کر اس نظام کو درہم برہم کر کے اپنے کچھ مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں' اور یہ حضرات مدارس اور دینی شعائر کے اچھے بھلے چلتے نظام کو مغرب کی خواہش پر وسائل سے محروم کرنا چاہتے ہیں' اور یہ لوگ "مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ" کے مصداق اپنے لئے جہنم کا راستہ آسان کر رہے ہیں۔

حالانکہ یہ تاثر حقیقت سے بہت دور ہے اور ایک بہت بڑی غلط فہمی اور بدگمانی کے سوا کچھ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دَور کا حصول و تقسیم زکوٰۃ کا نقشہ نہ دورِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے مشابہ ہے نہ دورِ خلافت راشدہ سے اور نہ ہی اوّلین فقہائے اُمت یعنی ائمہ اربعہ (چار فقہی مسالک) کے دورِ مبارک سے' بلکہ یہ تو اس دورِ انحطاط اور دین سے بیزاری کے گزشتہ چار صدیوں کے عرصہ میں زوال پذیر دینی جذبہ کی باقیات ہیں' جس میں یقیناً جذبہ اور خلوص تو رضائے الٰہی اور دین پر عمل ہے مگر خارج میں جامد اور منجمد روایات کے سوا شاذ ہی کچھ مثالیں سامنے لائی جا سکیں۔

لہٰذا اگر کچھ لوگ "فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ" (النساء:۵۹) کے مصداق اوپر بیان

کردہ موجودہ روایتی سوچ کے علاوہ کسی دوسرے نقطۂ نظر کو سامنے لاتے ہیں تو اس پر نہ دین دشمنی کا لیبل لگانے کی ضرورت ہے نہ آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لینے کی' بلکہ آنکھیں کھول کر آج کے حالات میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام پر عملدرآمد کے لئے از سرِ نو کوئی صورت نکالنے کی۔

ہمارے عام دینی طبقے کے لوگ اور علماء بھی گزشتہ چند صدیوں کے علماء و مجتہدین کا ذکر کرتے ہیں تو ایک لفظ 'متاخرین' کہہ کر ایک درجے میں استخفاف کرتے ہوئے اس رائے کو ناقابل التفات گردانتے ہیں' حالانکہ بدلے ہوئے حالات میں اگر رائے اور احکام بدل جائیں تو اسی کو اجتہاد کہتے ہیں۔ اور یہ اجتہاد بھی کسی عامی انسان کو نہیں بلکہ قرآن وسنت سے کماحقہٗ واقف شخص ہی کو کرنا ہے۔ اسی غلط تاثر کا ایک پہلو یہ ہے کہ مدارس میں زکوٰۃ کی وصولی ہوتی ہے' پھر تملیک کا مسئلہ بھی بیان ہوتا ہے' لہٰذا اب تملیک بھی ضروری ہے تو اس کے لئے 'حیلہ' کیا جاتا ہے' حالانکہ طلبہ کو بطورِ حیلہ رقم زکوٰۃ کی تملیک کے بعد اُن سے واپس لے کر اپنی مرضی سے خرچ کرنا اصولِ تملیک کے خلاف ہے' تملیک کے بعد تو مالک اپنے مال کو اپنی مرضی اور صوابدید پر جیسے چاہے خرچ کرے۔ پھر یہ کہ اگر تملیک کا مسئلہ اسی طرح حل ہو گیا تو مدارس کے محسنین تو وہ طلبہ ہیں جنہوں نے اپنی مِلک سے رقم مدارس کو مہیا کر دی نہ کہ وہ زکوٰۃ ادا کرنے والے حضرات و خواتین' جبکہ ان مدارس میں عزت اور آؤ بھگت اُن ہی معطی حضرات کی کی جاتی ہے اور وہ خرچ بھی اُسی رقم سے اٹھتا ہے۔ اس سارے معاملے کو دل مانتا بھی نہیں کہ صحیح ہو رہا ہے' مگر پھر بھی یہ سلسلہ چل بھی رہا ہے اور لوگ خاموش بھی ہیں۔

اجتہاد:

اجتہاد اور مجتہد ہماری دینی اصطلاحات ہیں۔ اجتہاد میں ہی اسلام کے ابدی دین ہونے کا راز مضمر ہے اور اسی کی تہہ میں ختم نبوت و رسالت (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی اٹل اور انمٹ حقیقت کا نقش کندہ ہے کہ اسلام کوئی جامد احکام کا مجموعہ نہیں' بلکہ اس میں نمو اور قیامت تک ہر قسم کے پیش آمدہ حالات کے مطابق اپنے متبعین کو راستہ دکھانے کی صلاحیت موجود ہے۔ اسی سے اسلام میں ایک حرکت اور dynamism کا جذبہ موجزن ہے۔

ہر انسان کی انفرادی زندگی بھی تغیر اور تبدیلیوں سے عبارت ہے اور انسان کے خارجی حالات اور داخلی احساسات وخیالات بھی ہر دم اور ہر لحظہ متغیر ہوتے رہتے ہیں اور اسی طرح مجموعی طور پر انسانی حسیات اور نسل انسانی بھی طفولیت سے لڑکپن اور جوانی اور بلوغت کی طرف بڑھی ہے۔ سابقہ انبیاء ورسل (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی تعلیمات اور شریعتیں انسانی حالات اور تغیر کے ساتھ حکمتِ الٰہی کے مطابق تبدیل ہوتی رہی ہیں' اور انسانی علم اور تجربے کے ایک خاص مرحلے پر اللہ تعالیٰ نے نبوت ختم فرمادی اور آخری وحی بھیج دی کہ اب انسان خود اس اصولی اور بنیادی آسمانی ہدایت سے قیامت تک اپنے اپنے حالات اور ظروف و احوال کے مطابق تفصیلی احکام اخذ کرتا رہے گا۔ اب دورِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے بعد سے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے اور اہل علم اس میدان میں محنت کر کے اُمت کی رہنمائی کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

(یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ ہر آدمی اجتہاد کرنے کے مقام پر فائز نہیں ہے اور نہ ہی ہر مدعی کو یہ مقام اُمت کی طرف سے دیا جاسکتا ہے۔ یہ تو اہل علم وفقہ اور قرآن وحدیث کے جاننے والے حضرات کی معتد بہ تعداد ہی کسی رائے کو معقول تسلیم کر لے تبھی وہ اجتہاد صواب شمار ہوسکتا ہے۔

واضح رہے کہ موجود بحث میں کم از کم تنظیم اسلامی اور انجمن کے پلیٹ فارم سے پیش کردہ آراء کسی از خود اجتہاد کا حصہ نہیں ہیں' بلکہ ان بہت سارے متاخرین اور دورِ حاضر کے علماء کی رائے کو اختیار کرنا ہے' جنہیں ہمارے بعض اہل علم متاخرین کی رائے کہہ کر حقارت سے ٹھکرا دیتے ہیں' حالانکہ اجتہاد کی ضرورت وافادیت اور جواز کے بعد متاخرین کی رائے ہی کو ہر دور میں صائب اور اقرب الی الصواب گردانا لازم ہے۔)

تاریخی حقائق:

اس سے پہلے کہ ائمہ اربعہ کے دور سے لے کر اب تک کے حالات کا اسلام کے حوالے سے جائزہ لیا جائے اور متعین کریں کہ ظروف واحوال میں کہاں اور کتنا فرق واقع ہوا ہے' یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی حقائق کا جائزہ لیا جائے کہ خود جناب رسول اللہ ﷺ کے

دورِ مبارک سے لے کر ائمہ اربعہؒ کے زمانہ تک حالات میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں اور اس کی بناء پر زکوٰۃ جیسے اہم مسئلے کے ضمن میں اصحاب علم وفضل اور اصحاب بصیرت رحمہم اللہ نے کیا کیا فیصلے فرمائے تاکہ فی نفسہٖ مسئلہ کا پس منظر روز روشن کی طرح واضح ہو جائے۔ آیئے اس پہلو سے حالات کا سلسلہ وار جائزہ لیتے ہیں' اور وہ یہ ہے

۱) اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کو عرب میں مبعوث فرمایا۔ یہ عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی امت تھے اور پچیس صدیوں کا فصل انہیں حقیقی اسلامی تعلیمات سے بہت دور لے گیا تھا اور مرورِ زمانہ کا گرد اُن کے نظریات وخیالات پر (ایک موٹی تہہ کی شکل میں) پڑ چکا تھا۔ اگرچہ کہیں کہیں حقیقت بھی آشکارا نظر آ جاتی تھی مگر مجموعی طور پر وہ راہِ حق سے دور نکل گئے تھے۔

اسی دین ابراہیمیؑ کے تانے بانے سے ہی شریعت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا خمیر اٹھا ہے اور حکمت الٰہی کے منشاء کے مطابق اس میں حک واضافہ سے تعلیمات اسلامی کا ہیولیٰ سامنے متشکل ہوا ہے۔ مختصر یہ کہ بعثت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے پہلے بھی اہل عرب اپنی آمدنیوں میں سے اللہ کے لئے حصہ نکالتے تھے (اگرچہ مشرکانہ ذہن کی وجہ سے اس میں سے ایک حصہ بُتوں کے نام کر دیتے تھے)۔ پھر وہ یتامیٰ' مساکین حجاج وغیرہ پر بھی خرچ کرتے تھے۔

۲) آغازِ وحی کے بعد قرآن مجید کی مکی سورتوں میں یتامیٰ' مساکین' غرباء پر خرچ کرنے کو (چاہے اسلام سے پہلے ہو یا اسلام قبول کرنے کے بعد) ایک نیکی شمار کیا گیا ہے۔ پھر بتدریج اس خرچ کرنے میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس انفاقِ مال کو بعد ازاں اللہ تعالیٰ کو 'قرض' دینے کے اعلیٰ مقام تک پہنچا دیا گیا۔ پھر مدنی دور میں اس انفاق کے دو درجے واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ ایک غرباء اور حاجت مندوں پر خرچ کرنا اور دوسرا دین کی ترویج واشاعت اور اس کی سربلندی کے لئے۔ دین کی سربلندی کی اس وقت واحد شکل غزوات اور جہاد کی تھی' اس لئے کہ اس دور کی جنگ رضاکارانہ افراد کی شرکت پر تھی اور عرب میں کوئی ہمہ وقت Standing Armies کا تصور نہیں تھا۔ پہلی صورت کے لئے عام طور پر لفظ 'صدقہ' بولا گیا اور 'صدقات' کا لفظ اسی کے

لئے مختص ہو گیا جبکہ دوسری مدّ کے لئے' قرضِ حسنہ' کا لفظ قرآن مجید میں آیا ہے اور اس کا درجہ بہت زیادہ بتایا گیا ہے۔

۳) زکوٰۃ بہ اختلاف روایات ۵ سے ۹ ہجری کے درمیان فرض ہوئی ہے جس کے ذریعے ایک عام مسلمان کے لئے صدقات اور اللہ کے لئے قرض حسنہ کی ایک ناگزیر کم از کم مقدار اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دی۔ اور یقیناً ایک عام مسلمان زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد ناگزیر صدقات اور دین کی اشاعت کی مدّ میں خرچ کرنے سے قانوناً بری ہو جاتا ہے اور اس کا بقیہ مال پاک شمار ہوتا ہے۔

اگرچہ اخلاقاً اور ایمان کے اعلیٰ درجات کی نسبت سے خرچ کرنے کی کوئی حد مقرر نہیں ہے اور دونوں مدّوں میں خرچ کرنے کے بارے میں قرآن میں مقربین بارگاہِ خداوندی کے لئے ''عفو'' کا لفظ آیا ہے' مگر یہ روحانی بلندی اور ذاتی نیکی کا مظہر ہے 'فرض' کے درجے کی چیز نہیں ہے۔

۴) سورۃ التوبہ کی آیت ۶۰ میں اس زکوٰۃ کی تقسیم کے لئے مدّات کا ذکر تفصیل سے آیا ہے۔ ان آٹھ مدّات میں اگرچہ 'فی سبیل اللہ' کا عنوان الگ موجود ہے مگر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں فقراء' مساکین اور مقروض وغیرہ پر خرچ کرنا بھی آج کے فقراء و مساکین پر خرچ کرنے سے مختلف تھا۔ دورِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی برکت تھی کہ کم از کم آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ اور دورِ خلیفہ اوّل بلافصل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک مسلمان ایک وحدت تھے۔ اور بقول اقبال ع

ہر مسلماں رگِ باطل کے لئے نشتر تھا!

غرباء و مساکین اور مجاہدین دو الگ کھاتے نہیں تھے' بلکہ ایک ہی انسانی گروہ تھا۔ وہ ضرورت مند بھی تھے اور وہی مجاہد فی سبیل اللہ اور غازی فی سبیل اللہ بھی۔ انہی مجاہدین میں سے کوئی قرض دار ہے تو اس کے قرض کی ادائیگی بھی اسی مدّ میں سے تھی۔ وہ بھی مجاہدین ہی کی بالواسطہ امداد تھی۔

لہٰذا اگر یہ فرض کیا جائے کہ ۱۳ھ تک زکوٰۃ کی تقسیم کی مدّات میں اسلام کی ترویج

واشاعت اور غلبہ وتمکن کا پہلو غالب تھا تو بے جا نہ ہوگا۔

۵) جناب رسول اللہ ﷺ کے دورِ مبارک میں زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا نظام بھی موجود تھا اور اس کی تفصیلات کتب احادیث میں موجود بھی ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ مبارک میں بھی یہی نظام جاری رہا' حتیٰ کہ مانعین زکوٰۃ سے جنگ کی گئی اور اسلام کے اجتماعی نظام' نظامِ خلافت کی بنیادیں مضبوط ہوگئیں۔

۶) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں فتوحات کا سلسلہ پھیلا۔ زکوٰۃ کے مال میں بے پناہ اضافہ ہوا' زکوٰۃ کی تقسیم کا نظام بہت وسیع ہوگیا' حکومت کی آمدنی کے ذرائع بہت پھیل گئے' کفالتِ عامہ کا نظام قائم کر دیا گیا' بھاری بھاری وظائف مقرر کئے گئے۔

۷) خلیفۂ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قائم کردہ نظام مستحکم رہا اور کفالت عامہ کے اسلامی نظام کی برکات اتنی ظاہر ہوئیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں زکوٰۃ کے نظام میں ایک بنیادی تبدیلی لانی پڑی۔

ہوا یہ کہ اسلامی خلافت کی حدود مغربی افریقہ سے کابل اور خراسان اور سندھ تک پھیل گئیں تو زکوٰۃ کی وصولی کا نظام اس دور میں اتنا مؤثر نہ رہا (یاد رہے کہ آج کے کمپیوٹر کے دور میں بھی امریکہ جیسے ملک میں شاید سو فیصد آبادی کو Tax Net میں رجسٹر کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے) اور ہر مسلمان کے مال کی تشخیص (assessment) کہ وہ صاحب نصاب ہے یا نہیں' پھر زکوٰۃ کی وصولی اور پھر تقسیم کا نظام عملی مشکلات کا شکار ہوگا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے مشورہ سے اتفاق رائے پیدا کیا اور زکوٰۃ کے ضمن میں اجتہاد کیا اور دو نئی اصطلاحات کا اضافہ کیا' عملاً مال زکوٰۃ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یعنی اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ۔

☆ اموال ظاہرہ: یہ وہ اموال ہیں جو اموال تجارت و زراعت اور دکانیں اور گودام ہیں' جن کو حکومتی اہل کار تشخیص کر سکتے ہیں۔

☆ اموال باطنہ: یہ وہ اموال ہیں جو آدمی کی ذاتی ملکیت اور گھر کے اندر غیر تجارتی نقطہ نظر سے محفوظ ہوتے ہیں' مثلاً سونا' چاندی' نقدی وغیرہ۔

اتفاقِ رائے یہ ہوا کہ اموالِ ظاہرہ کی تشخیص' رقم زکوٰۃ کی تعیین اور وصولی حکومتی اور

سرکاری سطح پر ہوگی' جبکہ اموال باطنہ کی تشخیص' تعیین اور مال زکوٰۃ کی تقسیم ذاتی اور نجی سطح پر ہر شخص خود کرے گا۔(۱)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں عام خوشحالی اتنی زیادہ تھی اور کفالت کا نظام اتنا منظم اور موثر تھا کہ ایک عورت اپنا مال زکوٰۃ تقسیم کے لئے لئے پھرتی تھی اور کوئی وصول کرنے والا نہ تھا (یاد رہے کہ یہ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ کا مال ہی تھا' ورنہ اموالِ ظاہرہ پر زکوٰۃ کی وصولی تو حکومت کا کام تھا۔)(۲)

۷) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت ہے۔ پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ' پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا دورِ حکومت اور اس کے بعد دورِ بنو امیہ ہے۔ پھر دور بنو عباس ہے۔ مگر خلافت راشدہ کے بعد حالات بدلتے چلے گئے اور دوسری صدی ہجری کے آغاز پر غزوات وقتال کا وہ تصور جو دورِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام یا دورِ خلافت میں تھا بالکل ختم ہوگیا اور کفالت عامہ کا تصور بھی پس پردہ چلا گیا۔

یہ مختصر جائزہ ہے ان تاریخی حقائق کا جو زکوٰۃ سے متعلق احکام کو سمجھنے کے لئے ہمارے نزدیک ناگزیر ہے۔

کلام نبوی ﷺ میں حالات کے تغیر کا ذکر:

جناب رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں بھی مکی دور اور مدنی دور اسلام کی تاریخ کے دو منفرد باب ہیں۔ مکی زندگی میں سفر طائف سے آپ ﷺ کی واپسی پر مکہ میں داخلہ کا مرحلہ ہے تو دوسری طرف مدنی زندگی میں فتح مکہ کے موقع پر ایک فاتح کی حیثیت سے دس فرشتہ صفت صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ آپ کا مکہ میں ورودِ مسعود ہے۔ اس کے بعد خلافتِ راشدہ کا سنہری دور ہے' پھر ملوکیت..... پھر مزید حالات کی خرابی۔ کلام نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم میں ان تبدیلیوں کا ذکر ہے۔ آپ ﷺ نے تاریخ اسلام کو پانچ ادوار میں تقسیم فرما دیا۔

پہلا دور ——— دورِ رسالت مآب ﷺ

دوسرا دور ——— دورِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ﷺ

---

(۱) اسلامی ریاست' ڈاکٹر حمید اللہ

(۲) بخاری' کتاب الزکوٰۃ۔ اسلامی ریاست' ڈاکٹر حمید اللہ

تیسرا دور ——— دورِ ملوکیت (مُلکاً عاضاً)
چوتھا دور ——— دورِ غلامی (ملکاً جبریاً)
پانچواں دور ——— عالمی خلافت اسلامی

آج اکیسویں صدی کے آغاز پر ہم دورِ غلامی کے دھندلکوں سے نکلنے کے قریب ہیں اور پانچویں دور یعنی (عالمی غلبہ اسلام) کی دہلیز پر ہیں۔ موجودہ عشرہ صبح کاذب ہے یا صبح صادق، یہ آنے والے دن ہی بتائیں گے۔ معنوی اعتبار سے رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد کے دور کو ایک انحطاط کا دور قرار دیا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِی ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ)) یعنی دورِ صحابہؓ کے بعد دورِ تابعینؒ اور اس کے بعد مزید حالات کی خرابی اور جذبہ ایمانی میں کمی کا دور آئے گا۔ ایک اور حکیمانہ قول میں آپؐ نے فرمایا:

((بدأ الاسلام غریبا وسیعود کما بدا فطوبیٰ للغرباء))

بھیآغاز اسلام کی مشکلات کے بعد ایک عروج کا دور ہوگا اور پھر اسلام دورِ آغاز کی طرح اجنبی بن جائے گا۔ یا تو حقیقی اہل ایمان کی تعداد کم رہ جائے گی، یا عمومی جذبۂ ایمانی سرد پڑ جائے گا یا دشمنانِ اسلام کی تعداد اور وسائل بے پناہ ہو جائیں گے۔ نتیجتاً اہل اسلام دنیا میں اجنبی بن کر رہ جائیں گے۔

صورت بایں جا رسید:

دورِ بنواُمیہ کا آخری حصہ اور دورِ بنوعباس کا نصف اوّل اگرچہ ظاہری اعتبار سے اور عام دنیاوی تاریخ میں اعلیٰ انسانی اقدار، عدل وانصاف اور رعایا پروری، علم وفن کی ترقی اور نت نئی ایجادات کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ دور رہا ہے اور تقریباً کل مشرق وسطیٰ سمیت مسلمان علاقوں میں تہذیب و ثقافت کی نہایت اعلیٰ روایات قائم ہوئیں۔ سپین میں آٹھ صدیوں تک اسلامی تہذیب و ثقافت کا ڈنکا بجا۔ تاہم اسلامی تعلیمات کے لحاظ سے یہ دَور کسمپرسی کا ہی دَور شمار ہوتا ہے۔ پھر سقوطِ بغداد (۱۲۵۸ء) اور سقوطِ غرناطہ (۱۴۹۲ء) کے بعد تو گویا عالم اسلام دشمنانِ اسلام کے ہاتھوں تباہ ہو گیا اور ہماری اعلیٰ روایات اور اخلاقی قدریں نہ صرف پامال ہوگئیں بلکہ نسیاً منسیاً ہوگئیں۔ خلافتِ عثمانیہ نے ان روایات کو کچھ سہارا دیا مگر یہ سہارا جذبے کی کمی کی وجہ سے زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوسکا اور مسلمان حکمران برصغیر

نہ میڈیا ہے نہ حکومتی وسائل۔ اس کے برعکس دشمنان اسلام بچے کھچے اسلامی تصورات اور خاندانی نظام کو تباہ کرنے کے درپے ہیں۔

غرض نہ مدنی دور کے مشابہ قتال اور غزوات کا نقشہ ہے نہ حالات' نہ ہی ائمہ اربعہ کے دور جیسے جہاد کی شکل ہے اور نہ ان میں شمولیت کے ذرائع' نہ بیت المال ہے نہ مسلمانوں میں زکوٰۃ کی تقسیم کا کوئی اجتماعی نظام۔ (حکومت نے بینکوں سے زکوٰۃ کی کٹوتی کا نظام بنایا ہے' وہ بھی ایک عشر عشیر کے برابر ہے اور محل نظر بھی) مزید برآں دینی جذبے کے انحطاط کی وجہ سے سب مسلمان صاحب نصاب نہ زکوٰۃ دیتے ہیں' نہ اس کا شوق رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس بنکوں میں زکوٰۃ کی کٹوتی جیسے معاملے میں اہل سنت عوام میں سے کتنے ہی لوگوں نے کٹوتی سے استثناء کے لئے شیعہ مسلک میں نام درج کرا دیا' جب کہ بعض صورتوں میں یہی لوگ زکوٰۃ کی وصولی میں زکوٰۃ کمیٹیوں میں پیش پیش رہے۔

یہ ہے وہ نقشہ جو ہمارے دائیں بائیں ہر صاحب نظر دیکھ سکتا ہے اور اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے جذبہ کی گہرائی اور گیرائی میں شدید قلت کا اور ایمانی جذبات سے تہی دامانی کا۔

الی اللہ الاشتکاء وعلیہ التکلان!

اجتہاد کے ضمن میں ہماری اعلیٰ روایات:

تاریخ اسلام میں اگر فقہ اسلامی کی ترقی وترویج اور ایک فن کی حیثیت اختیار کرنے کی روایات کو پرکھا جائے اور ان کا تتبع کیا جائے تو اجتہاد کے سلسلے میں مسلمانوں کی اعلیٰ علمی خدمات اور شاندار روایات کا ایک چمن زار نظر آئے گا جس کی نظیر شاید ہی دنیا میں کہیں اور تلاش کی جا سکے۔ آج ہمیں گزشتہ ادوار کا صحیح پس منظر اور منظر نامہ سامنے نہ ہونے کی وجہ سے یہ اعلیٰ روایات محض چند فقہاء کے اختلافات اور باہمی موشگافیوں کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ تاہم ذرا دقت نظر سے مطالعہ کریں تو انسانی مزاج اور نفسیات کے عین مطابق فقہائے اسلام کی اس محنت میں موشگافیوں' ذاتی رنجشوں' ہم عصری کے فتنوں اور شاید بعض صورتوں میں باہمی رقابتوں کا عنصر بھی بعید از قیاس نہ ہوتا' ہم مجموعی طور پر ہر غیر جانبدار قاری اس علمی ذخیرے کے سلسلے میں کی گئی کاوشوں کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا' اور غیر مسلم تک معترف

ہیں کہ دوسری' تیسری اور چوتھی صدی ہجری مسلمانوں کے علمی ورثے میں عروج کا زمانہ ہے' جس وقت کہ یورپ جہالت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا اور وہ اسے Dark Ages کہتے ہیں۔

ہم مسلمان خود بھی اس دور کے بارے میں پڑھتے ہیں تو اس دور کے اختلافات کو سطحی لے لیتے ہیں' حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ائمہ اربعہ نے بھی باہمی اختلاف کیا ہے تو اس میں کچھ اصول فقہ کے اختلاف کے باوصف زمانے اور حالات کا اختلاف سب سے بنیادی اور فیصلہ کن عامل ہے۔ ذرا غور کریں کہ اگر امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے ان کے شاگرد امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ اور امام محمد رحمتہ اللہ علیہ اختلاف کرتے ہیں تو اس اختلاف میں باقی تمام امکانات معدوم کے درجے میں ہیں سوائے اس وجہ کے کہ معاشرہ جس تیزی سے خلافت راشدہ والے خالص اسلامی معاشرے سے ملوکیت کے زیر اثر جا رہا تھا وہ اس اختلاف رائے اور خارج میں ظروف و احوال کی وہ تبدیلی' تبدیل شدہ اجتہادی رائے کا باعث بنی ہے۔ مزارعت کے بارے میں امام مالک رحمتہ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ ایک رائے رکھتے ہیں' جبکہ ایک نسل کے فرق کے ساتھ یہ اجتہادی رائے تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس اجتہادی رائے کی تبدیلی کو اس پاکیزہ ماحول میں نہ کسی نے ''تفسیر بالرائے'' سے تعبیر کیا' نہ نفسانی خواہش کہا' بلکہ اہل علم نے قبول کیا۔ علیٰ ہذا القیاس ہمارے اسلاف نے اس اجتہاد کو ہر موقع پر ''بروقت'' استعمال کر کے امت محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کی صحیح رہنمائی کا حق ادا کیا ہے۔ اگرچہ ہم عمومی طور پر اس اختلاف کو محض اختلاف کہہ کر شرمندگی محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو اچھا ہوتا' جبکہ حقیقت میں یہی وہ علماء و فقہائے اسلام کا ہماری تاریخ میں سنہری کارنامہ ہے کہ اسلام کو درپیش ہر چیلنج کا مقابلہ کیا ہے اور قرآن و سنت کے اصولوں کا علم ہر قسم کے نامساعد حالات میں بھی سربلند رکھا ہے۔

اسی سلسلے میں ہمارے متاخرین فقہاء ہیں جنہوں نے حالات کے حد درجہ تغیر کی بنا پر اسلاف کی آراء سے اختلاف کیا اور مخلصانہ اجتہاد کیا' مگر عام طور پر اسے متاخرین کی رائے کہہ کر نہ صرف متاخرین کے متاخرین اس کو رد کر دیتے ہیں بلکہ اسلام کے اصول اجتہاد کی جڑ کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں (یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ ہر آدمی اٹھ کر اپنی رائے پیش کرے اور اسے اجتہاد کا درجہ دے دیا جائے' یہ ممکن نہیں) گویا اجتہاد کا دروازہ بند کرنے اور بند

رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ ہمارے ماضی قریب کے علماء میں سے کتنے ہیں جنہیں ہم غزالیٔ زماں' رازیٔ دوراں' بیہقیٔ وقت اور وقت کے امام ابوحنیفہؒ کہہ کر پکارتے ہیں' مگر ان کے کئے گئے اجتہاد کو متاخرین اور دورِ جدید کے علماء کی رائے کہہ کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور قیاس مع الفارق کرتے ہوئے ہزار سال پرانے حالات میں علماء کی تفاسیر اور آراء کو آج کے حالات پر چسپاں کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ یہ جسارت نہیں تو اور کیا ہے؟ اسلام کے اصولِ اجتہاد کے آگے بند باندھنے کی کوشش نہیں تو اور کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ماضی قریب کے جن علماء نے اسلاف سے بعض معاملات میں الگ رائے دی ہے ان کا جذبہ اور خلوص بتا رہا ہے کہ واقعتاً اگر ائمہ اربعہ رحمہم اللہ میں سے کوئی اس وقت موجود ہوتے تو وہ بھی یہی فتویٰ دیتے۔

تو ائمہ فقہاء کے درمیان آراء کے باہمی اختلاف قرونِ اُولیٰ میں بھی تھے جو مجموعی طور پر ظروف واحوال کے اختلاف کی وجہ سے اجتہادی رائے کی تبدیلی کا مظہر تھے اور متاخرین اور دورِ حاضر میں اگر تبدیل شدہ حالات میں کوئی اجتہادی رائے دی گئی ہے تو وہ بھی خلوص و اخلاص پر مبنی اور قابل ستائش ہے جس طرح کہ اسلاف میں علماء وفقہاء نے اپنے اپنے وقت میں اجتہادی آراء دی ہیں۔ مثلاً:

اگر امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے زکوٰۃ کی رقم سے راستوں اور پلوں کی تعمیر پر خرچ کرنے کی اجازت دی ہے تو صحیح ہے۔

اگر امام محمد رحمۃ اللہ نے حجاج پر زکوٰۃ کی مد سے خرچ کرنے کو کہا ہے تو صحیح ہے۔

اگر دیگر ائمہ نے ''فی سبیل اللہ'' کے مفہوم کو غزوات اور قتال سے عموم دے کر دشمن کے خلاف تیاری کے سلسلے میں تمام اقدامات کو شامل کر دیا ہے تو یہ بھی اتنا ہی درست ہے۔

اسی طرح آج کے حالات میں اگر علماء اسلام موجودہ حالات میں نئی رائے دیتے ہیں تو یہ بھی ماضی کی طرح صد فی صد درست ہوگی۔

حالات کی پکار:

گزشتہ تین چار صدیوں (الف ثانی کے دوران) میں اسلام کے زوال اور مغرب کی بالادستی اور چیرہ دستی کے دور میں مجموعی طور پر مسلمانوں پر جو کچھ گزرا ہے وہ اب تاریخ کا

حصہ ہے۔ برعظیم پاک و ہند میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی شاندار خدمات' دیگر مجددین کے کارنامے' حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کی قلمی کاوش' تحریک شہدینؒ' جنگ آزادی کے دوران مجاہدین کی سرفروشانہ خدمات' بعدازاں ریشمی رومال کی تحریک' جمعیت علمائے ہند کی کوششیں اور تحریک پاکستان کے سلسلے میں علماء کی خدمات' یہ حالات تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف سے درج ہیں' مگر اب حالات ماضی سے بہت مختلف ہیں۔ عوام میں دینی عنصر اور جذبہ رو بہ زوال ہے۔ مغربی افکار و نظریات ہماری نئی نسل کو جدیدیت اور فیشن کے نام پر عریانی اور فحاشی کے ساتھ ساتھ اباحیت پرستی (کہ مذہب کی رو سے حلال و حرام کی کوئی اہمیت نہیں' ہر چیز حلال ہے' اسے استعمال کرو اور فائدہ اٹھاؤ) کی طرف لے جا رہے ہیں۔

مغربی اقوام جدید وسائل سے لیس ہو کر نہ صرف ہمارے خلاف صف آرا ہیں بلکہ دل میں بغض رکھتے ہوئے صلیبی جنگوں کے نام سے ہم پر حملہ آور ہو چکے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مسلمانوں میں جذبۂ اسلامی اور جذبہ ملی ہوتا' متحد ہوتے' دشمن کے خلاف ڈٹ جاتے' تمام اختلاف بھلا دیتے' حکمران بھی مسلمانی کا ثبوت دیتے اور سیاسی لیڈر بھی صحیح رہنمائی کرتے اور حق کا ساتھ دیتے' مگر ـــــ وائے افسوس کہ ایسا نہیں ہے' ہمارے مسلمان ممالک کے اکثر حکمران مغرب زدہ اور مغرب پرست ہیں' بلکہ ان کے پروردہ اور ان کے مقاصد کو آگے بڑھانے والے اور شاید اُن کے تنخواہ دار (Confidential Pay Roll) پر ہیں۔ ان حالات میں اسلام کی کشتی کو کون عالمِ اسباب میں ساحلِ مراد تک پہنچائے گا۔ اس کے لئے جو لوگ انفرادی طور پر' یا جو ادارے' انجمنیں' جماعتیں' جمعیتیں اور دینی و مذہبی سیاسی پارٹیاں کام کر رہی ہیں اُن کے وسائل اور افرادی قوت کا مغرب کی قوت سے کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ جیسے سورۃ الانفال میں ایک اور بیس کی نسبت قرار دیا گیا ہے کہ کوئی بات نہیں' ہمت نہ ہارو اے اہل ایمان! کفار کے مقابلے میں ڈٹ جاؤ۔ مگر آج ضعفِ ایمانی کے ساتھ ساتھ وسائل میں شاید ایک اور ہزار کا فرق واقع ہو چکا ہے۔

اس بات سے مایوسی پھیلانا مقصود نہیں بلکہ حقیقت حال واضح کرنا ہے اور ہمت دلانا ہے کہ مبارک ہیں وہ لوگ جو اِن حالات میں بھی کشاکش میں مصروف ہیں۔

کشائش خس و دریا ہے دیدنی کوثر
اُلجھ رہے ہیں زمانے سے چند دیوانے!

ان مزاحمتی قوتوں کے پاس وسائل کی شدید کمی ہے اور ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعہ کے بعد تو امریکی دباؤ میں جس طرح تمام دینی عناصر اور بالخصوص اسلام کے غلبہ کے لئے ہر کاوش کے علمبردار افراد کو ''دہشت گرد'' قرار دیا جارہا ہے اور ان کی مالی امداد کو بھی ''دہشت گردی سے تعاون'' کا جرم قرار دیا جارہا ہے' یہ حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ اسلام کی cause کے لئے کی جانے والی ہر کاوش کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جائے۔ باہمی اختلافات (جو کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جون ۱۹۲۰ء کی دارالعلوم دیوبند کی تقریر میں اشارہ کیا تھا) کو بھلا دیا جائے اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر نصب العین کی طرف بڑھتے چلے جایا جائے۔ یہ تعاون ہر طرح کا ایثار طلب کرتا ہے' تاہم وسائل کی کمی راستے کی رکاوٹ ہے۔ شاید عوام کی غربت کے لئے امریکی امداد آجائے' یو این او کی مدد آجائے' پھر حکومتوں کی آمدنی' Taxes کا نظام اس کام کے لئے مختص ہے' سرکاری سطح پر جیسے تیسے تین چار ارب روپے ہر سال زکوٰۃ تقسیم کی ہی جاتی ہے۔

مگر — اسلام کی علمبردار ان مزاحمتی قوتوں' مدارس' انجمنوں کے لئے امداد اور تعاون کے راستے دن بدن مسدود ہو رہے ہیں۔

لہٰذا وقت کی پکار یہ ہے کہ ؎

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا!

ان اداروں کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں اور ان کے لئے مالی وسائل کے راستے پیدا کئے جائیں۔

مگر — یہ کیسے ہو' یہ لمحۂ فکریہ ہے' اور اسلام کے فقہاء اور اہل حل وعقد کے لئے سوچنے کا مقام ہے۔

تطبیق:

عالم اسلام کی زبوں حالی اور دشمنانِ اسلام اور اعدائے دین کی دلیری اور سرکشی کا سب سے اعلیٰ اور تیر بہدف علاج تو یہ ہے کہ کرۂ ارضی پر کسی ایک مسلمان ملک میں اسلامی

انقلاب برپا ہو اور خلافت کا نظام دوبارہ آ جائے جو ہمارے دین کا تقاضا ہے اور جس کی پیشین گوئیاں فرمائی ہیں جناب الصادق والمصدوق حضرت محمد ﷺ نے۔ جو مسلمانوں کے تمام مسائل کو حل کر کے بیت المال کا قیام کرے' نصب امامت ہو اور زکوٰۃ سمیت تمام ارکانِ اسلام اور احکامِ خداوندی کما حقہ پورے ہوں۔ مگر اس بات کا عالم اسباب میں دور دور تک کہیں امکان نہیں ہے۔ (اگرچہ مشیتِ ایزدی سے کچھ بعید نہیں اور اس کے لئے سر توڑ کوشش کے ساتھ ساتھ بارگاہ ربّ العزت میں دعا کرتے رہنا چاہئے۔)

دوسرے درجے میں ممکن حل یہ ہے کہ عوام کے دباؤ پر مسلمان حکمران (جو کہ اکثر کلمہ گو مسلمان ہیں) جاگیں' عام زندہ اور ترقی پذیر قوموں کی طرح مقصد پر اکٹھے ہوں' مشترکہ ادارے بنائیں۔ اسلامی سربراہی کانفرنس (OIC) کے تحت ہی سہی' اکٹھے ہو کر اپنے مسائل کا حل نکالیں اور دشمنوں سے چوکنے ہو کر ان سے نبرد آزما ہونے کا جذبہ پیدا کریں' عوام کو جگائیں۔ میڈیا' ریڈیو' ٹی وی' اخبارات اور تعلیم کو اس مقصد کے لئے استعمال کریں تاکہ اسلام زندگی کے تمام شعبوں میں داخل ہو جائے اور "اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً" کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جائے۔ زمین پر موجود حقائق کی روشنی میں یہ بھی دُور کی بات نظر آتی ہے۔

تیسرے اور آخری درجے میں حل یہ ہے' اور یہی کم سے کم درجے میں قابل عمل ہے' کہ اس محاذ پر موجود افراد' انجمنوں' اداروں اور جماعتوں کو زندہ رکھا جائے اور ان کے وسائل میں کمی نہ آنے دی جائے۔

اگرچہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کو اس کے لئے دل کھول کر مالی امداد دینی چاہئے مگر جیسا کہ ظاہر ہے کہ مثالیت پسندی اور واقعیت پسندی میں یہی فرق ہے کہ مثالیت پسندی (Idealism) کے اعتبار سے تو یہ صحیح ہے کہ ہر مسلمان کلمہ گو کو اِس ضمن میں آگے بڑھ کر اس مبارک مقصد میں حصہ ڈالنا چاہئے' مگر واقعیت پسندی (Realism) کے اعتبار سے نہایت اہم بات یہ ہے کہ عملاً کتنے لوگ دینی شعائر کا اہتمام کرتے ہیں۔ بمشکل پانچ فیصد لوگ نمازِ پنجگانہ ادا کرتے ہیں۔ ان میں سے کتنے لوگ واقعی دین پر خرچ کرنے پر آمادہ ہیں۔ یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ دین کے لئے دامے درمے سخنے کام کرنے والوں کی شدید کمی ہے اور اسے قحط الرجال کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو۔

آخری تجزیے میں اور کم از کم درجے میں قابل عمل بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو ناگزیر

اور فرض صدقات کی ادائیگی پر ابھارا جائے (اور یہ حقیقت ہے کہ اکثر لوگ دینی اعتبار سے کم سے کم پر ہی اکتفا کرتے ہیں) اور پھر اس زکوٰۃ کے استعمال میں دیگر مدّات کو دبا کر ''فی سبیل اللہ'' کی مدّ کو اہمیت دی جائے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا' عوام کی فلاح و بہبود کے منصوبے تو یو این او' امریکہ اور تمام حکومتیں اور NGO's کر ہی رہی ہیں۔ جس مقصد کے لئے کہیں سے امداد کی موہوم (remote) توقع بھی نہیں ہے وہ اسلام کی حفاظت و سربلندی کا مقصد ہے۔ لہٰذا یہ صحیح اور برمحل بات ہے کہ اسلام ہی اس دور میں سب سے زیادہ یتیم ہے۔

زکوٰۃ کی مدات میں ''فی سبیل اللہ'' کی وضاحت میں ہمارے قابل قدر اسلاف نے بڑے قیمتی اشارے دیئے اور رہنمائی کی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی ہمت کر کے اور اسلام کے نقطۂ نظر سے حالات کا مطالعہ کر کے اجتہادی شان کے ساتھ آگے بڑھے اور ''فی سبیل اللہ'' کے ضمن میں توسیع کا مظاہرہ کر کے آج کی جملہ دینی خدمات جو غلبۂ اسلام اور حفاظتِ اسلام کے سلسلے کی ہوں' اس میں شامل کرنے کا جواز مہیا کرے۔

اگر ایسا ہو جائے تو اسلام کا مستقبل تابناک ہے۔ اس سے بے پناہ وسائل ہاتھ آئیں گے اور بے شمار محاذوں پر کام کے دروازے کھلیں گے اور بالآخر اللہ نے چاہا تو نتیجہ خیز بھی ہوں گے۔ پھر ہمارے دینی مدارس میں حیلہ کرنے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہے گی۔

[یہ آخری جملہ شاید مضحکہ خیز ثابت ہو۔ راقم اس کی قدرے مثال سے وضاحت کئے دیتا ہے۔ تمثیل اور کیمرے کی فوٹو کے بارے میں عالم عرب اور پاک و ہند و بنگلہ دیش کے علماء میں اختلاف رائے ہے۔ جہاں تک ہاتھ سے بنائی ہوئی تصویر کا تعلق ہے' یہ متفق علیہ طور پر حرام مطلق ہے' اگرچہ ہمارے ہاں اس پر عمل نہیں ہوتا۔ اور شاید ہی کوئی بڑا مذہبی رہنما ہو جس کے ہاتھ سے بنے ہوئے قد آدم پورٹریٹ بنائے اور لگائے نہ جاتے ہوں' مگر کیمرے کی تصویر میں علمائے پاک و ہند و بنگلہ دیش کہتے ہیں کہ یہ بھی حرام ہے۔ مگر چند ناگزیر تمدنی ضروریات کے لئے جائز ہے۔ اگرچہ اس ضمن میں بھی عوام و خواص سبھی اس کی واضح خلاف ورزی کرتے ہیں' اور ہمارے ہاں اگر کسی عالم دین کی مثال کہیں مذہبی حلقوں میں پیش کر دی جائے تو اس کا دفاع یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ علماء کا عمل اور چیز ہے' اور فتویٰ اور چیز ہے مگر پھر بھی

حرام کے مرتکب کو علی الاعلان حرام کا مرتکب نہیں کہتے۔ دل میں بہرحال کسک باقی رہتی ہے اور تشفی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس عالم عرب کے علماء (علمائے ازہر وغیرہ) کی رائے یہ ہے کہ کیمرے کی تصویر حرام نہیں ہے' تقویٰ کے خلاف ہے۔ تاہم اسی تصویر کا عریانی وفحاشی کے فروغ کے لئے استعمال (یعنی بُرا استعمال) بہرحال حرام ہے۔

اب عملاً خلاف ورزی وہاں بھی ہے اور یہاں بھی اور نتیجہ دونوں آراء کا ایک ہی ہے' لیکن ہمارے ہاں کا عام مسلمان ذہنی خلفشار میں رہتا ہے اور وہاں کا مسلمان ذہنی سکون میں]

یہی کیفیت ہوگی اس جواز کے فتویٰ کے بعد کہ موجودہ حیلہ کے طریق پر عملدرآمد سے بہرصورت اہل تقویٰ کے دل میں اضطراب کی کیفیت رہتی ہے جبکہ فتویٰ کے بعد زکوٰۃ کی رقم کا استعمال تو بہرحال وہی ضروریات دینی ہی ہوں گی مگر اضطراب قلبی سے نجات ضرور میسر آ جائے گی' اور یہ بہت بڑا فرق ہے۔

ایک اور اہم نکتہ جس پر اسی مقام پر غور ضروری ہے اور موجودہ صورت حال میں بہت اہم ہے' وہ اموالِ باطنہ اور اموالِ ظاہرہ کی تقسیم کے حوالے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں کیا گیا فیصلہ ہے شاید وہ فیصلہ جتنا آج کے دور سے متعلق تھا اتنا شاید ماضی میں نہیں تھا۔

ایک صدی قبل تک انسان کی انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی کے دائرے ایک ہی نہج پر صدیوں سے چلے آ رہے تھے۔ انفرادیت کا دائرہ بہت وسیع تھا جبکہ اجتماعیت کا دائرہ بہت مختصر اور محدود۔ اجتماعیت کے دائرہ میں حکومتوں کے معاملات اور حکومتوں کا عمل دخل انسان کی انفرادی زندگی کو محدود طور پر اور عشر عشیر کے طور پر متاثر کرتا تھا۔ ماضی میں حکمران بدل جاتے تھے' بادشاہتیں بدل جاتی تھیں' مگر عوام پر اس کا اثر بہت کم پڑتا تھا۔

اس کے برعکس جدید دور میں اور مغرب کے نظریات وافکار کے تحت تمام ممالک میں اجتماعیت کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے اور انفرادیت کا دائرہ سکڑتا جا رہا ہے' اور شاید مغربی معاشرہ میں انفرادیت سکڑ کر ایک نقطہ پر آ گئی ہے۔

آج کا اجتماعی ڈھانچہ اور حکومتوں کا عمل دخل ہمارے نظام تعلیم' معاشرت' معیشت' تفریح' حتیٰ کہ عادات واطوار تک کو متاثر کر رہا ہے۔ پانی' بجلی اور گیس جیسے معاملات بھی اجتماعی شکل اختیار کر کے حکومتوں کے کنٹرول میں چلے گئے جو اسے اکثر و بیشتر سیاسی حربے

کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ آج کا انسان اپنے بچوں کو اپنی مرضی کے کھیل اور تعلیم بھی فراہم نہیں کر سکتا اور یہ دائرہ ہر دن وسیع ہوتا جا رہا ہے۔

اس پس منظر میں نہایت بالغ نظری اور دُور بینی کا فیصلہ ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جماعت صحابہ رضوان اللہ علیہم نے کیا کہ اموال کو اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ میں تقسیم کر دیا۔ اموال ظاہرہ حکومتوں کا دائرہ ہے اور اموال باطنہ نجی سطح پر افراد خود اپنے داخلی یقین و ایمان کی کیفیات کی روشنی میں اور خالصتاً تعلق مع اللہ کے جذبے سے معین بھی کریں گے اور حقداروں میں صدقات تقسیم بھی کریں گے۔

اگر چہ یہ تقسیم نظام خلافت کے قیام کی متقاضی ہے مگر جب تک وہ خیر و برکت والا نظام قائم نہیں ہوتا موجودہ حالات میں ہر وہ ادارہ جو اسلام کے نظام خلافت کی ترویج اور قیام کے لئے کوشاں ہے (وہ تعلیم دین کا شعبہ ہو' قرآنی تعلیمات کے عام کرنے کا شعبہ ہو' شعورِ دین پیدا کرنے کی تحریک ہو یا سیاسی سطح پر عوام کو بیدار کرنے اور باطل کے خلاف صف آرا کرنے کا کام ہو جس کی آخری شکل کبھی قتال اور جہاد بالسیف بھی ہو سکتی ہے) وہ نظام خلافت کا قائم مقام ہے۔ لہٰذا حالات کی پکار اور تقاضا یہ ہے کہ اس (ظاہرہ اور باطنہ) تقسیم کو قائم رکھتے ہوئے اس کے مصارف کا دائرہ بھی معین کر دیا جائے۔ اوپر درج انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تقسیم کے حوالے سے جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ حسبِ ذیل ہے۔ اگر اہل علم اس بات کا وزن محسوس کریں اور بات معقول ہو تو ضرور اس پر صاد کریں اور اختیار فرمائیں' وگرنہ رد کر دیں۔

۱) اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ تصریح کے ساتھ الگ اکٹھی کی جائے اور اموال باطنہ کی زکوٰۃ الگ۔

۲) اوپر درج ادارے اور انجمنیں جو اسلام کی آبیاری اور اس کی ترویج کے کام کر رہی ہیں' یا اس نظام خلافت کے قیام کے لئے کوشاں ہیں' وہ اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ کو ان اجتماعی مصارف ''فی سبیل اللہ'' کی مد سے خرچ کریں' اور جیسا کہ سلف سے ہی تقسیم کر دی گئی ہے کہ لام تملیک کے بجائے 'فی' کے استعمال کی وجہ سے 'فی سبیل اللہ' میں تملیک کا مسئلہ بھی صد فی صد متفق علیہ نہیں ہے' لہٰذا اس حصہ کی رقم میں تملیک کا مسئلہ بھی اتنا اہم نہیں رہے گا اور اسلاف سے تمسک بھی رہے گا۔

جبکہ انہی مقاصد میں کوشاں افراد اور ان سے متعلقہ لوگ اموال باطنہ کی زکوٰۃ کے مستحق اور حق دار قرار دیئے جائیں۔ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا' جہاد و قتال کے لئے

نکلنا تو جہاد ہے ہی' مجاہدین اور نمازی حضرات کے گھروں کی نگہداشت' ان کے بیوی بچوں کی ضروریات اور کفالت' ان کی عزت و آبرو کی حفاظت حتیٰ کہ جہاد میں شمولیت کی غرض سے گھوڑے پالنا اور ان کی نگہداشت بھی کم تر درجہ میں سہی جہاد کا حصہ ہی شمار ہوتی ہے۔ لہٰذا بالواسطہ طور پر ہی سہی ایسے افراد بھی فی سبیل اللہ ہی کے ضمن میں مصروف عمل ہیں اور ان کی کفالت و نگہداشت اموال باطنہ کی زکوٰۃ سے کی جانی چاہئے اور اس میں تملیک کا مسئلہ سامنے رہے تو ضروری ہے تاکہ حقداروں تک مال و اسباب پہنچتا رہے اور درمیان میں غبن اور غصب نہ ہو جائے۔ اسی تملیک کی شکل آج سرکاری سطح پر یہ ہے کہ وہ رقم متعلقہ فرد کے اکاؤنٹ میں جمع کرادی جائے تاکہ کوئی تیسرا آدمی اس کو ہڑپ نہ کر سکے۔

اگر یہ تقسیم کر دی جائے اور غور و فکر کے بعد تسلیم کر لی جائے' اور بظاہر اس میں کوئی بڑی رکاوٹ نہیں ہے' تو اسلام کی آبیاری کی کاوشوں کو حیات تازہ اور جذبۂ تازہ مل سکتا ہے۔

استفتاء نہیں' حکمت کی ضرورت ہے:

مروّجہ مفہوم میں استفتاء اور فتویٰ کے یہی معنی غلط العام ہیں کہ صورت مسئولہ میں کوئی صاحب علم جو مسند فتویٰ پر تشریف رکھتے ہیں وہ سابقہ علماء اور فتاویٰ کی کتب سے عبارات نقل کر کے ایک تحریر سائل کے حوالہ کر دیں' اللہ اللہ خیر سلا۔

جبکہ موجودہ درپیش صورت حال میں یہ مسئلہ بہت وسیع الاطراف بھی ہے اور گہرا بھی۔ پھر اس کا تعلق نہ صرف مسلمانوں کی موجودہ زندہ نسل سے ہے بلکہ آئندہ نسلوں سے بھی۔ تیسری طرف یہ نہ صرف ہمارے لئے ایک فرض کی ادائیگی کا مسئلہ ہے بلکہ امت مسلمہ کی بقا کا مسئلہ ہے۔ ماضی میں سقوط بغداد (۱۲۵۸ء) اور سقوط غرناطہ (۱۴۹۲ء) ایسے ہی حالات کا نقشہ ہیں کہ دشمنوں نے ہمیں نیست و نابود کرنے کی کوشش کی اور ہمارا اجتماعی نظام تو زمین بوس کر دیا' عام مسلمانوں پر بھی زندگی دوبھر کر دی۔

آج یہی معرکۂ روح و بدن موجودہ مسلمانوں کو درپیش ہے اور ابلیس اپنے یورپی اور امریکی درندوں کو ابھار کر مذہب و روحانیت' عدل و انصاف' شرافت و حیا اور نیکی اور پارسائی جیسی اقدار کے حامل لوگوں کا صفایا کر دینا چاہتا ہے تاکہ ابلیس اور اس کے کارندوں کو بغیر کسی مزاحمت کے پورے روئے ارضی کا وسیع میدان مل جائے اور ابلیس اور انسانوں میں سے

یہودی دنیا میں عالمی حکومت کا تخت بچھا کر وسائل سے فائدہ اٹھائیں اور عیش کریں۔ ''فتنہ دجال'' موجودہ حالات ہی کا عنوان ہے جو احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم میں وارد ہوا ہے۔ فتنۂ دجال' دجالیت اور معین شخص دجال یہ بہت بڑا فتنہ ہے اور اس فتنہ سے پناہ مانگی ہے حضرت محمد ﷺ نے اور ہمیں بھی تلقین فرمائی ہے۔ نیز یہ بھی فرمایا ہے کہ تاریخ عالم میں فتنہ دجال سے بڑا اور کوئی فتنہ اہل ایمان کے لئے نہیں ہے۔

لہٰذا اس وقت کے مسائل صرف فتویٰ سے نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حکمت اور تدبر سے حل ہوں گے۔ حکیم کا لفظ ایک تو جسمانی علاج کرنے والے حضرات کے لئے استعمال ہوا ہے مگر یہی لفظ اُمت مسلمہ کے مسائل کے حل اور اُن کے لئے تگ و دو اور سعی و جہد کے ضمن میں نمایاں پیش رفت کرنے والے افراد کے لئے بھی آیا ہے اور یہ زیادہ صحیح مقام اور محل ہے لفظ حکیم کا۔ چنانچہ ماضی قریب میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو کہا گیا اور جدید تعلیم یافتہ حضرات میں سے جناب علامہ اقبال کو حکیم اور حکیم الامت کے نام سے پکارا گیا۔ یہ حکمت سچے ایمان کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔ اس حکمت و فراست کے حامل ہزاروں نہیں تو سینکڑوں افراد ضرور امت میں موجود ہیں۔ فرمان نبوی ﷺ ہے:

((اِتَّقُوْا فَرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ)) (۱)

''مومن کی فراست سے بچو' اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔''

آج فتویٰ کی بجائے اس حکمت اور فراست کی ضرورت ہے۔ آج ہمارے درمیان مولانا مفتی محمود' مولانا شاہ احمد نورانی' مولانا یوسف بنوری' مولانا مفتی محمد شفیع' مولانا شبیر احمد عثمانی' مولانا انور شاہ کاشمیری اور مولانا عبداللہ غزنوی رحمہم اللہ جیسے علماء و فضلاء نہ سہی' ان کے علم کے حقیقی وارث تو موجود ہیں۔ حالات کی رفتار کو دیکھیں' حالات کا رُخ دیکھیں اور کشتی اسلام کو مخالف موجوں اور طوفانوں میں گھرا دیکھیں۔ استخارہ کریں' دعائیں کریں اور فراستِ مؤمنانہ سے کام لے کر اُمت کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیں۔ حکمت کا لفظ شاید ہمارے فقہی اثاثے میں اجنبی ہو اور یقیناً غیر مانوس ہے فقہی اصطلاح تو اجتہاد ہے۔ تو آمدم برسر مطلب کہ موجودہ علماء و صلحاء اُمت کو اجتہاد سے کام لینا چاہئے اور یمین و یسار اور ظروف و احوال کے مطابق بحر قرآن اور بحر علوم حدیث سے موتی نکال کر اسلام کے

(۱) ترمذی' عن ابی سعید رضی اللہ عنہ

دائمی اور ابدی دین ہونے کا ثبوت فراہم کرنا چاہئے۔

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے!

اُمت مسلمہ کے ناگفتہ بہ حالات پر نگاہ ڈالتے ہوئے ایک اور ثقیل اصطلاح جو ہمارے حافظے میں تو محفوظ ہے' ہمارے لٹریچر کا بھی حصہ ہے' ہماری زبان پر بھی ہے' مگر اس لفظ کا استعمال شاید کلمۂ کفر کہہ دینے کے قریب قریب شمار ہوتا ہے' وہ لفظ ہے مجدّد۔ یہ لفظ خود ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

((اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا))(۱)

ماضی کے اکابرین میں مجددین کی فہرست ہے اور حضرت شیخ احمد سرہندیؒ مجدد الف ثانی کہلاتے ہیں اور مشہور عالم ہیں۔ تاہم یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہ بات تو خیر کھینچا تانی کی بن جائے گی کہ اس وقت مجدد کون ہیں؟ تاہم پچھلی دو صدیوں میں ایک نہیں کئی حضرات اس مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔ چنانچہ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے ضمن میں حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ' تبلیغ میں حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ سیاسی جدوجہد میں حضرت شیخ الہند محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم ہیں۔ اس سلسلے میں دیگر اہم شخصیات نے بھی نہایت اعلیٰ اور وقیع کام کئے ہیں اور اُمت کی رہنمائی کی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جیسے ''مفقود الخبر شوہر کے انتظار کی مدت'' کے بارے میں اسلاف کی رائے سے ہٹ کر اجتہاد کیا اور مجتہدانہ شان سے فیصلہ دیا حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اور ۱۹۴۶ء میں تحریک پاکستان کے حق میں اُمت کے مصالح کے پیش نظر فیصلہ دیا علماء نے بنارس کانفرنس میں آج اسی طرح اگر علماءِ حق کسی اجتہاد کے حق میں اتفاق پیدا کرلیں تو یقیناً آنے والے حالات کا رُخ اُمت مسلمہ کے حق میں بجانب خیر موڑا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم!

تتمہ

خلافت راشدہ کے مبارک دَور میں اموالِ باطنہ و اموالِ ظاہرہ کی شکلیں بہت محدود تھیں' جبکہ آج اکیسویں صدی میں اموالِ ظاہرہ کی شکلیں بے شمار ہیں اور اموالِ باطنہ بھی

(۱) ابو داود' مستدرك حاكم' عن ابی هريرة رضی الله عنه

مختلف النوع صورتوں میں ممکن ہیں اور الحمدللہ کہ علماء حالاتِ حاضرہ سے باخبر ہو کر دین کی طرف سے عائد کردہ اجتہاد کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی سعی فرما رہے ہیں۔ اسی طرح ضرورت اس امر کی ہے کہ 'فی سبیل اللہ' کے لفظ میں جو توسع کی گنجائش ہے اسے کھولا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کے دورِ مبارک کے بعد اِن الفاظ کا مصداق 'غازی' سے بڑھا کر حاجی' اور دیگر امورِ خیر کو بھی محیط سمجھا گیا تھا' تو آج ہزار سال بعد تغیر حالات کے پیش نظر سبیل اللہ کی تشریح اور مصداق کو از سرِ نو کیوں متعین نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن مجید میں تو ہر دور کے لئے رہنمائی موجود ہے اور یقیناً ''لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُهٗ وَلَا یَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ'' کے زیرعنوان علماء قرآن کے الفاظ کے اندر ہر قسم کے بدلے ہوئے حالات میں روشنی کی کرن رہنمائی کے لئے موجود پائیں گے۔

اسی زکوٰۃ ہی کے ضمن میں ابھی نہ معلوم اور کتنے دور آئیں گے اور علماء کو محنت کر کے اور خطا کا risk لے کر اجتہاد کرنا پڑے گا۔ ہمارے ماں باپ قربان ہوں حضرت محمد ﷺ پر جنہوں نے آج کے اہل علم کی حوصلہ افزائی کے لئے فرمایا ہے کہ مجتہد مخطی کے لئے بھی ایک حصہ ثواب کا یقینی ہے' اور اگر اللہ تعالیٰ کی تائید و رہنمائی سے اجتہاد کما حقہ ہو گیا جیسا کہ مشیتِ خداوندی ہے' تو دوہرا ثواب ہو گا۔

مستقبل کے آنے والے ادوار میں سے شاید آخری دور دورِ خلافت (جو کہ ان شاء اللہ اب عالمی دور ہو گا) کا نقشہ جناب رسول اللہ ﷺ نے کھینچا ہے ان الفاظ میں جو کہ صحیح بخاری' باب وجوب الزکاۃ میں وارد ہوئے ہیں کہ قیامت سے قبل ایک وقت ایسا آئے گا کہ صدقہ دینے والا صدقہ لے کر پھرتا ہو گا اور کوئی وصول کرنے والا نہیں ہو گا کہ لوگ اس کے حاجت مند نہیں ہوں گے۔ (۱)

یہی وہ دور ہے کہ حضرت محمد ﷺ کا لایا ہوا دین وسعت پذیر ہو کر تمام روئے ارضی پر پھیل جائے گا (۲) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد پر وہ صلیب توڑ دیں گے اور خنزیر کا کھانا دنیا میں بند ہو جائے گا۔ قتال فی سبیل اللہ (بھی چاہے تھوڑے عرصے کے لئے ہو) موقوف ہو جائے گا کہ تمام روئے ارضی پر اسلام غالب آ چکا ہو گا' کفالتِ عامہ کا نظام قائم ہو گا'

(۱) عن حارثة بن وهب رضی اللہ عنہ وعن ابی موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ

(۲) مسند احمد بن حنبل' عن المقدار رضی اللہ عنہ

(باقی صفحہ 64 پر)

اسلام اور سائنس

قسط نمبر ۳

مذہب، فلسفے اور سائنس کے تطابق کی روشنی میں

زمین پر زندگی کا نظام الاوقات

تحریر: سید قاسم محمود

فرض کرو، ہماری زمین کی عمر ایک سال کے برابر ہے۔ اب اگر ہمیں یہ حساب لگانا ہو کہ زمین کی پوری تاریخ میں زندہ اشیاء یہاں کس حساب کتاب سے آباد ہوئیں، تو اس کا نقشہ کچھ یوں ہوگا۔ یہ نقشہ ہم نے مؤرخ رچرڈ کیرنگٹن کی کتاب "History of the Earth" (زمین کی تاریخ) سے اخذ کیا ہے:

یکم جنوری تا ۳۱ راگست (ابتدائی آٹھ ماہ تک زمین پر زندگی کے کوئی آثار نہ تھے)
یکم ستمبر تا ۳۱ راکتوبر (زندگی کے بالکل ابتدائی آثار اور نمونے ظہور میں آئے، بیکٹیریا وغیرہ)
یکم نومبر تا ۷ ردسمبر (حشرات، مچھلیاں، پرندے اور رینگنے والے جانور)
۸ ردسمبر تا ۳۰ ردسمبر (دودھ پلانے والے جانوروں کا ظہور)
۳۱ ردسمبر (آدھی رات کو پونے بارہ بجے آدمی کا ظہور۔ بارہ بجنے میں ایک منٹ پر تحریری تاریخ کا آغاز۔

کائنات کی تخلیق

اب تک حاصل شدہ انسانی علم اور کائنات کی تخلیق کے بارے میں جاری نظریے (بگ بینگ) کے مطابق زمین کی عمر تقریباً ساڑھے چار ارب سال بتائی جاتی ہے۔ خود زمین کائنات کا ایک معمولی اور چھوٹا سا نقطہ ہے، جیسے ایک ہمہ وقت پھولتے، پھیلتے، بہت بڑے غبارے پر ایک بھوری چیونٹی۔ کائنات کی عمر کا ابھی اندازہ نہیں ہوسکا، البتہ کائنات اور زمین کی تخلیق کے بارے میں قرآن مجید میں جو آیات، نشانیاں اور اشارے دیئے گئے ہیں ان

سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ کائنات کی عمر کا حساب لگانا ممکن ہے' جو حضرتِ انسان اپنی متجسسانہ طبیعت' تسخیر کائنات کے جذبے اور لگن سے ایک نہ ایک دن ضرور لگا لے گا۔ سورۃ الحدید کی ابتدائی پانچ آیات پر غور کیجئے:

﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۞ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۞ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۞ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۭ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۭ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۞ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۞﴾

''جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہیں' اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ وہ زبردست حکمت والا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کی ہے۔ وہی زندگی دیتا ہے اور موت بھی۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی اوّل ہے' وہی آخر۔ وہی ظاہر ہے' وہی باطن۔ اور وہ ہر چیز کا بخوبی جاننے والا ہے۔ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا' پھر عرش پر مستوی ہوگیا۔ وہ خوب جانتا ہے اس چیز کو جو زمین کے اندر داخل ہو' اور جو چیز اُس میں سے نکلتی ہو اور جو چیز آسمان سے نیچے آئے اور جو چیز چڑھ کر اُس میں جائے۔ اور جہاں کہیں تم ہو' وہ تمہارے ساتھ ہے اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ دیکھ رہا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اُسی کی ہے' اور تمام کام اُسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔''

ان آیات میں صرف یہی نہیں بتایا گیا کہ تمام آسمان اور یہ زمین' گویا پوری کائنات اللہ تعالیٰ نے چھ دن میں تخلیق کی تھی' بلکہ زندگی کے آثار وظہور کے بارے میں بھی صراحت کردی گئی۔ جتنی بھی چیزیں زمین کے اندر داخل ہوتی ہیں' مثلاً بارش کے قطرے' دریاؤں کا پانی' اناج اور پھلوں کے بیج وغیرہ اور جتنی بھی چیزیں زمین سے باہر نکلتی ہیں' مثلاً فصلیں' نباتات' پودے' درخت' خوشبو والے پھول' اللہ ان تمام زندہ اشیاء کی کمیت و کیفیت کو خوب جانتا ہے۔

کائنات کی تخلیق چھ دنوں میں ہوئی۔ اس کا ذکر بعض دوسری آیات میں بھی آیا ہے۔

سورۃ ق (آیت ۳۸)' سورۃ السجدۃ (آیت ۴)' سورۃ الاعراف (آیت ۵۴) اور سورۂ یونس (آیت ۳) میں صاف صاف بتایا گیا ہے: ''بلاشبہ تمہارا ربّ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین (کائنات) کو چھ روز میں پیدا کیا' پھر عرش پر قائم ہوا' وہ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے''۔

یوم سے کیا مراد ہے؟

ان آیات میں دو الفاظ تشریح طلب ہیں: ''عرش'' اور ''یوم''۔ عرش کیا ہے؟ عرش ابھی تک سائنسی علوم کے حیطۂ تحقیق و جستجو میں نہیں آیا۔ ''عرش'' سے ملتا جلتا لفظ ''فلک'' بے شک ماہرین فلکیات نے اپنے قابو میں کر لیا ہے' لیکن ''عرش'' جس پر اللہ تعالیٰ کائنات کی تخلیق چھ دنوں میں کرنے کے بعد مستوی اور قائم ہو گیا ہے' الٰہیات کی اصطلاح ہے اور ایک ایسا رمز جس کے اسرار جاننے کے لئے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور ان جیسے دوسرے مفکرین کی طرف رجوع کرنا ہو گا جنہوں نے اپنی زندگیاں قرآن میں غور و فکر کے لئے وقف کر رکھی ہوں۔ البتہ لفظ ''یوم'' پہلے عام گھڑیوں اور اب ''اٹامک کلاک'' کے شمار میں آ گیا ہے۔ بائبل میں ''یوم'' سے مراد وہ دن ہے جو ہماری گھڑیوں کے عین مطابق ہے' یعنی چوبیس گھنٹے کا دن جو ایک طلوعِ آفتاب سے دوسرے طلوعِ آفتاب تک چلتا ہے' لیکن آیاتِ قرآنی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''یوم'' سے مراد دَور (Era) ہے' جسے ہندی میں جُگ کہتے ہیں۔ ''دَور'' اُس لمبی مدت کو کہتے ہیں جس کا آغاز کسی خاص واقعے سے ہوا ہو۔ مثلاً عیسوی دَور یا عیسوی سن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یومِ ولادت سے شروع ہوتا ہے۔ یا مثلاً سن ہجری حضور نبی کریم ﷺ کی ہجرت سے شروع ہوتا ہے۔ پتھر کا دَور' کانسی کا دَور' قدیم دَور' جدید دَور' یہ سب ادوار کسی ایک دن پر محتوی نہیں' بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں سال کی طویل مدت پر محیط ہیں۔

قرآنِ حکیم میں لفظ ''یوم'' جہاں جہاں کائنات کی تخلیق و ارتقاء کے باب میں آیا ہے' وہاں اِس کا مفہوم ''دَور'' (Era) ہے' اور دَور کئی کئی سو اور کئی کئی ہزار سال کا ہو سکتا ہے۔ سورۃ السجدۃ (آیت ۵) میں ''یوم'' کی مدت ایک ہزار سال شمار کی گئی ہے:

﴿یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾

''اللہ آسمان سے لے کر زمین تک ہر اَمر کی تدبیر کرتا ہے' اور اس تدبیر کی روداد اُوپر

اس کے حضور جاتی ہے' ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار کے حساب سے ایک ہزار سال ہے۔''

سورۃ الحج کی آیت ۴۷ میں بھی یہی کہا گیا ہے۔ سورۃ المعارج کی چوتھی آیت میں تو یوم کی مدت پچاس ہزار سال شمار کی گئی ہے:

﴿مِنَ اللّٰهِ ذِی الْمَعَارِجِ ۞ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِیْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۞﴾

''(کافروں کے لئے عذاب) اللہ کی طرف سے ہے جو عروج کے زینوں کا مالک ہے۔ ملائکہ اور روح اس کے حضور اوپر چڑھ کر جاتے ہیں' ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔''

توریت میں کائنات کی تخلیق کے بارے میں آیا ہے کہ ''اللہ نے ہفتے میں چھ دن کام کیا اور کائنات کو بنایا' ساتویں دن ہفتے کے روز تھک کر آرام کیا''۔ اسی لئے یہودی ہفتے کے روز (سبت) چھٹی مناتے ہیں اور آرام کرتے ہیں' لیکن قرآن کریم نے اس کی پُرزور تردید کی ہے۔ سورۃ ق کی آیت ۳۸ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۞﴾

''اور ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ اِن کے درمیان میں ہے' ان سب کو چھ دن میں پیدا کیا اور ہم کو تکان نے چھوا تک نہیں۔''

غرض' کائنات کی تخلیق کے چھ ایام (سِتَّةِ اَيَّامٍ) سے مراد چھ ادوار ہیں' اور ایک ایک دَور کئی لاکھ یا کروڑ یا ارب سال کا ہو سکتا ہے۔ جوں جوں انسان علم و عقل سے کام لے کر' تحقیق در تحقیق کرتا جائے گا' حقیقتِ منتظر کے راز ہائے سربستہ کھلتے جائیں گے۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق دس ہزار ملین برس پہلے ہماری دودھیا کہکشاں (Milky Galaxy) کی طرح ہزاروں کہکشائیں' جن میں سے ہر ایک کروڑہا ستاروں پر مشتمل تھی' کائنات کی بنیادی اکائیوں کی صورت میں قائم ہو گئی تھیں۔ خود ہماری زمین آج سے ساڑھے چار ارب سال پہلے وجود میں آئی تھی۔ اس کی عمر کا سائنٹیفک تخمینہ لگا لیا گیا ہے۔

زمین کی تخلیق

سورۃ حٰم السجدۃ (آیات ۹ و ۱۰) میں صاف صاف زمین کی تخلیق اور ساخت کے

بارے میں وضاحت آئی ہے۔ ترجمہ ملاحظہ کیجئے:

''(اے نبیؐ! ان سے) کہو: کیا تم اس اللہ سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھہراتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا؟ وہی تو سارے جہانوں کا ربّ ہے۔ اس نے (زمین کو وجود میں لانے کے بعد) اوپر سے اس پر پہاڑ جما دیئے اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لئے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک اندازے سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا۔ یہ سب کام چار دن میں ہو گئے۔''

اصل کلامِ الٰہی آواز کے ساتھ اور ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کیا جائے تو کرۂ ارض اور اس پر آباد زندہ مخلوقات کا نقشہ سامنے آ جاتا ہے:

﴿قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۞ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَا اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ۞﴾

ان آیات کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے زمین کو دو دن (یَوْمَین) میں بنا دیا۔ ان ابتدائی دو دنوں میں زمین کی تخلیق مکمل ہوئی۔ ان دو ادوار کو سائنس کی اصطلاح میں عاری از حیات (Azoic) کہتے ہیں۔ ان دونوں ادوار میں ابھی زندگی کی نمود نہیں ہوئی تھی۔ عاری از حیات' ٹھوس مادے سے بنایا ہوا' یہ خالص پتھریلا دَور زمین کی پیدائش کے ساتھ ہی ساڑھے چار ارب سال پہلے شروع ہوا اور تین ارب سال تک جاری رہا۔ سادہ لفظوں میں یوں کہئے کہ زمین کی پیدائش کے بعد تین ساڑھے تین ارب سال تک زمین کا مادّی و طبعی ارتقاء ہوتا رہا اور زندگی کسی بھی شکل میں کرۂ ارض پر نمودار نہیں ہوئی۔ زمین برابر ٹھوس اور سنگلاخ ہوتی رہی۔

زمین دو دن (یَوْمَین) یعنی دو ادوار میں تو تخلیق ہوئی' لیکن زمین بننے کے بعد چار دن (اربعۃ ایّام) میں زندگی اور اس کی متنوع صورتیں نمودار ہونا شروع ہوئیں' اور ان میں سے ہر ایک کی طلب و ضرورت کے مطابق ٹھیک اندازے سے خوراک کا سامان فراہم کیا گیا۔ ان ''اربعۃ ایّام'' یا زمین پر زندگی کے ٹائم ٹیبل کو چار ادوار میں یوں تقسیم کیا جاتا ہے:

(i) پہلا یوم (زمانہ)۔ بالکل ابتدائی زمانہ Pre-cambrian

یہ زمانہ آج سے تین ارب سال پہلے شروع ہوا اور ستاون کروڑ سال تک جاری رہا۔

آخری ستاون کروڑ سال کے حالات تو ماہرین ارضیات نے (دوسرے متعلقہ علوم مثلاً جغرافیہ، بشریات، اثریات اور حیاتیات وغیرہ کے ماہرین کے تعاون و اشتراک سے) کافی حد تک معلوم کر لئے ہیں، لیکن زمین کے گیس اور مائع مادے سے ٹھوس شکل اختیار کرنے سے پیشتر کے حالات اب تک پردۂ اخفا میں ہیں اور نہ ہی زمین کے ٹھوس ہونے سے پہلے کے تین ساڑھے تین ارب سال کے واقعات کا علم ہو سکا ہے۔ یہ وہ دَور ہے جب پوری طبعی و مادی کائنات ارتقائی مراحل طے کر رہی تھی، اور زمین کو باقی کائنات سے کٹے ہوئے زیادہ مدت نہیں گزری تھی۔ زمین کی پوری سطح محض چٹان تھی۔ اس دَور میں زندگی کا سراغ کہیں نہیں ملتا۔ اسے مخفی حیات کا زمانہ بھی کہتے ہیں۔

(ii) دوسرا یوم (زمانہ) Palaeozoic

اسے قدیم حیاتی زمانہ کہا جاتا ہے۔ یہ زمانہ آج سے ستاون کروڑ سال پہلے شروع ہوا اور ستائیس کروڑ سال تک جاری رہا اور ۲۳ کروڑ سال پہلے پری دَور میں جو ''قیامت'' آئی تھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔

اس زمانے میں ابتدائی اور سادہ ترین زندگی کے آثار ملتے ہیں۔ گھونگے، آبی کیڑے مکوڑے، نرسل اور بچھور کازات، منجمد پتھر (فوسل) کی صورت میں ملے ہیں۔ یہ تمام ابتدائی جانور اور پودے سمندر کے اتھلے پانی میں رہتے تھے۔ زندگی ابھی تک صحیح معنوں میں خشکی پر یا سمندر میں آباد نہیں ہوئی تھی، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس زمانے کی زندہ مخلوقات سب سے پہلی زندہ مخلوقات نہیں تھیں، بلکہ یہ ایسی پہلی پہلی زندہ موجودات تھیں جن میں اپنے آپ کو پتھر میں تبدیل کر کے ٹھوس حالت میں محفوظ ہو جانے کی صلاحیت تھی۔ کرۂ ارض کے مختلف طبقات کی نچلی پرتوں میں جن اوّلین زندہ مخلوقات کے رکازات ملتے ہیں، وہ یہی چیزیں ہیں۔ دوسرے یعنی قدیم حیاتی زمانے کو چھوٹے چھوٹے چھ ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے، جن کی تفصیل یہ ہے:

(ا) کیمبری دَور (Cambrian): اوّلین سادہ سمندری زندگی کا دَور۔ اب سمندری گھاس پیدا ہو رہی ہے۔ یہ دَور ستاون کروڑ سال پہلے شروع ہوا اور چھ کروڑ سال تک جاری رہنے کے بعد ختم ہو گیا۔ کیمبری چٹانوں کی نسبت سے اس دَور کا نام ''کیمبری'' اس لئے رکھا گیا کہ یہ چٹانیں انگلستان کے علاقے کیمبر لینڈ میں واقع ہیں، جس کا جدید نام ویلز ہے۔ اس دَور میں انگلستان کا بیشتر علاقہ سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ بلکہ پورے کرۂ ارض کا اکثر حصہ کم گہرے سمندروں سے ڈھکا ہوا تھا۔ خشکی پر سمندر کا پانی اترتا چڑھتا رہتا تھا۔ موسم

گرم اور ہموار تھے۔ موسموں میں کوئی تغیر و تبدل نہ ہوتا تھا۔ ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں کی پیدائش شروع ہے۔ سبز نیلی الجی موجود ہے جو آج تک موجود ہے اور ستاون کروڑ سال سے زمین کی چھاتی پر مونگ دَل رہی ہے۔ ایک ہزار سے زائد انواع کے حیوانات کا سراغ مل گیا ہے جو اُس وقت موجود تھے اور جن کا سائز سوئی کی نوک سے لے کر اٹھارہ انچ تک تھا۔ اب ان میں سے ایک بھی حیوان موجود نہیں۔

(۲) آردوویسی دَور (Ordovician): اس دَور کا نام شمالی ویلز کے قدیم برطانوی قبیلے کے نام پر رکھا گیا۔ یہ دَور تقریباً پچاس کروڑ سال قبل شروع ہو کر چوالیس کروڑ سال قبل ختم ہوا۔ گویا چھ کروڑ سال تک کارفرما رہا۔ اس دَور میں سمندر کا پانی اترنے لگا' اگرچہ انگلستان پھر بھی سطح سمندر سے نیچے ہی رہا۔ اس دَور میں بھی سمندر سابقہ دَور کی طرح کبھی خشکی پر بڑھتے رہے اور کبھی پیچھے ہٹتے رہے۔ زمین کی سطح پر کہیں کہیں پہاڑ نظر آنے لگے۔ زمین سے آتش فشاں لاوے بار بار پھوٹتے تھے۔ موسم اب بھی گرم اور ہموار تھے۔ موسمی خطے نمایاں نہیں تھے۔ سمندری زندگی کا یہ حال تھا کہ ریڑھ والے اوّلین جانور' بغیر جبڑے کی مچھلی اور جوڑ والے پاؤں کے جانور موجود تھے۔ نباتاتی زندگی ابھی تک صرف سمندری گھاس اور کائی تک محدود تھی۔ خشکی پر اب بھی کوئی زندگی نہ تھی۔

(۳) سلوری دَور (Silurian): ماہرینِ ارضیات نے اس دَور کا نام بھی شمالی ویلز کے ایک قدیم قبیلے کا نام پر رکھا۔ یہ دَور آٹھ کروڑ سال تک جاری رہا۔ اس دَور میں بھی سمندر وقتاً فوقتاً آگے بڑھتے اور پیچھے ہٹتے رہے تھے' جس کی وجہ سے خشکی پر باقاعدہ تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ پہاڑوں کے نئے نئے سلسلے بن رہے تھے۔ لاوا پھوٹنے کی حرکت کم ہو رہی تھی۔ عام طور پر موسم گرم اور ہر جگہ یکساں تھا' لیکن بعض مقامات پر انتہائی خشک تھا۔ اس دَور کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ریڑھ کی ہڈی والے نئے جانور پیدا ہوئے۔ سمندری بچھو اور جبڑے والی مچھلیاں پیدا ہو گئیں اور نو نو دس دس فٹ لمبے جانور بن گئے۔ نباتاتی زندگی تھوڑی سی مزید آگے بڑھی۔ خشکی پر سب سے پہلے بغیر پتوں والے پودے سمندروں کے کناروں کے ساتھ ساتھ پیدا ہوئے۔ خشکی پر نباتاتی اور حیوانی زندگی کا ظہور اسی دَور میں ہوا۔

(۴) ڈیونی دَور (Devonian): یہ خشکی کے اوّلین جانوروں اور پودوں کا دَور ہے۔ پانی سے باہر خشکی پر رہنے کے لئے جانوروں اور پودوں کو بڑی بڑی مشکلات کا

سامنا کرنا پڑا' کیونکہ اس وقت تک پودے صرف پانی میں اُگنے اور نشو ونما پانے کے عادی تھے۔ اسی طرح جانور بھی ابھی تک صرف پانی میں ملی ہوئی ہوا کے سہارے زندہ تھے۔ یہ مشکلات رفتہ رفتہ ختم ہوگئیں' وہ اس طرح کہ پودوں میں چوبی بافتیں پیدا ہوگئیں جو پودے کا وزن بھی خود سہارتی ہیں' نیز پتوں کو پانی بھی پہنچاتی ہیں۔ ریڑھ والے جانوروں کے ارتقاء میں تیزی آ گئی۔ نرم ہڈی کی مچھلی اور ہڈی دار مچھلی پیدا ہوئیں۔ ابتدائی شارک مچھلی بیس فٹ لمبی پیدا ہوئی' اسی لئے اس دَور کو ''مچھلی کا دَور'' کہتے ہیں۔ اس دَور میں جل تھلیے (Amphibian) پیدا ہونے شروع ہوئے' یعنی وہ جانور جو خشکی پر رہنے کے باوجود انڈے پانی میں دیتے ہیں۔ چنانچہ بے ریڑھ کے آبی جانوروں کا ارتقاء خشکی پر بھی شروع ہو گیا' جن میں ہزار پا' کن کھجورے' جوں' چیچڑی' مکڑی اور بغیر پروں کے کیڑے شامل ہیں۔ یہ دَور دو کروڑ سال تک جاری رہا۔

(۵) کاربنی دَور (Carboniferous): یہ دَور آج سے ۳۵ کروڑ سال قبل شروع ہوا اور ۳۰ کروڑ سال قبل تک جاری رہا' یعنی اس دَور کی کل عمر پانچ کروڑ سال تھی۔ اس دَور کے آغاز میں کم گہرے سمندر دَور دَور تک پھیلے ہوئے تھے۔ یورپ اور روس کا بہت بڑا حصہ پانی کے نیچے تھا۔ بعد میں سمندروں کی تہہ اونچی ہونی شروع ہوئی۔ یورپ اور شمالی امریکا میں خشکی کے قطعات نیچے دب کر دلدل پیدا ہوگئی۔ شمال میں کوئلہ پیدا ہونا شروع ہوا۔ گلی سڑی سبزیوں سے پہلے دلدلی کوئلہ اور بعد میں پکا کوئلہ بنا۔ اس دَور میں موسم نہایت خشک تھا' لیکن بعض علاقوں میں گرم اور مرطوب تھا' جہاں گھنی سبزیاں پیدا ہوگئیں۔

یہ خشکی اور تری دونوں میں زندہ رہنے والے جانوروں اور پودوں کا دَور ہے۔ جانوروں میں بڑی بڑی تبدیلیوں اور ترمیموں کے بعد گلپھڑوں کی جگہ پھیپھڑے پیدا ہوئے۔ یاد رہے کہ خشکی پر پہلے پودے اور نباتات آئے اور جانور بعد میں۔ اسی دَور میں جل تھلیے پیدا ہوئے' یعنی وہ جانور جو تری اور خشکی دونوں میں زندہ رہ سکتے ہیں' مثلاً مینڈک۔ خشکی پر اگرچہ نباتاتی اور حیوانی زندگی کا ظہور ہو چکا تھا' لیکن یہ ابھی پانی کے قریب ہی رہتی تھی۔ اسے ابھی خالص خشکی پر رہنا نہیں آیا تھا۔ سمندر کے کناروں کے ساتھ ساتھ کی خشکی پر بلاشبہ کئی جانور آ گئے تھے اور کئی پودے اگ گئے تھے' لیکن باقی خشکی کا سارا حصہ ویران اور بنجر پڑا ہوا تھا اور وہاں زندگی ابھی تک نہیں گئی تھی۔

(۶) پرمی دَور (Permian): یہ دَور آج سے ۳۰ تا ۲۵ کروڑ سال قبل کے زمانے پر پھیلا ہوا ہے' یعنی اس کی عمر پانچ کروڑ سال تھی۔ اس دَور میں زمین کی حرکات اور تغیرات بہت بڑھ گئے۔ یورپ' ایشیا اور مشرقی امریکا میں اونچے اونچے پہاڑ بنے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں موسموں کا فرق پیدا ہوا۔ کرۂ ارض کا شمالی حصہ عام طور پر خشک رہا' لیکن بعض بعض مقامات پر آب و ہوا گرم تر بھی رہی' لیکن جنوبی حصہ برف سے ڈھکا رہا۔

اس دَور میں سمندری زندگی کی برتری ختم ہوگئی۔ خشکی پر حیوانات اور نباتات کی کثرت ہوگئی۔ اس دَور میں قیامت شروع ہوئی جو تیسرے زمانے کے ترِیائی دَور تک جاری رہی۔ اس قیامت نے اکثر و بیشتر چھوٹی مخلوقات کو صفحۂ ہستی سے نابود کر دیا اور سمندر کی بالائی و زیریں زندگی کو تہہ و بالا کر دیا۔ سب پودے نیست و نابود ہو گئے۔ جانوروں میں سے صرف ستارہ مچھلی اور خارپشت رہ گئیں' باقی تمام جانوروں کو قیامت نے ہمیشہ کے لئے مٹا دیا اور ان کے نام صرف حیاتیات کی کتابوں میں رہ گئے۔

(iii) تیسرا یوم (زمانہ) Mesozoic

درمیانی حیاتی زمانہ۔ یہ زمانہ آج سے ۲۵ کروڑ سال قبل شروع ہو کر چھ کروڑ سال قبل ختم ہوا' یعنی تقریباً ۱۹ کروڑ سال تک چلتا رہا۔ اس زمانے میں گرمی ذرا اور بڑھی' نیز فضا بھی مرطوب ہوگئی تو نئی نئی قسم کے پودے اور جانور پیدا ہونے لگے۔ نباتاتی اور حیوانی زندگی کی بیک وقت خشکی اور تری دونوں میں زندہ رہنے کی خصوصیت کم سے کم تر ہونے لگی۔ درخت بور کی بجائے بیج اگانے لگے۔ جانوروں نے زمین پر انڈے دینے شروع کئے' کچھ دن اپنے انڈوں کی گرمی پہنچاتے رہے' اور جب اس طرح نیا جانور پیدا ہوا تو وہ اپنی زندگی کے پہلے لمحے ہی سے سمندر سے بے نیاز تھا۔ ان جانوروں کو خزندے (رینگنے والے) کہا جاتا ہے۔ اس زمانے کی چند مخلوقات آج بھی زمین پر پائی جاتی ہیں' مثلاً سانپ' بامنی' گوہرا' چلپاسہ' مگرمچھ اور کچھوا۔

تیسرے زمانے کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) ترِیائی دَور (Triassic): اس دَور کے اوائل میں کرۂ ارض کے شمالی حصے میں آب و ہوا خشک ہونے کی وجہ سے نباتات نہیں بڑھیں' لیکن آخری حصے میں جب ہوا کچھ تر ہوئی تو صنوبر' تاڑ اور فرن کی اقسام پیدا ہوئیں۔ اس دَور کا وسطی زندگی کا زمانہ برہنہ تخم

پودوں کا زمانہ کہلاتا ہے' یعنی ایسے پودے جن کے بیج بیضہ دان میں نہ ہوں' جیسے صنوبری درختوں میں چلغوزہ وغیرہ۔

(۲) جراسی دَور (Jurassic): ترِیائی دَور میں جو نئے پودے نمودار ہوئے تھے وہ اس دَور میں بڑھتے گئے۔ بعض تاڑ کی قسم کے پودوں کے شگوفے نکلے۔ یہ پھولوں کے ارتقاء میں پہلا قدم تھا۔ یہ نام فرانس کے پہاڑ جورا کے نام پر جراسی رکھا گیا ہے۔

(۳) چاک کا عہد (Cretaceous): اس دَور میں کھریا مٹی کے ذخیرے عام ہو گئے۔ بڑے بڑے پہاڑ بنے۔ پت جھاڑ درخت' منگولیا' پوپلر اور پلین زیادہ ہو گئے۔ کیڑے اور رس دار پھول ایک ساتھ نمودار ہوئے۔ پھولوں کی اقسام میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ حشرات بھی بڑھتے گئے۔ ہڈی دار مچھلی میں بھی بہت شاخیں پیدا ہو گئیں۔ چنانچہ مچھلی سمندر کی برتر مخلوق بن گئی اور اس کی یہ حیثیت اب تک قائم ہے۔ رینگنے والے جانوروں کے چھوٹے چھوٹے اگلے بازو نکل آئے اور اُن کے آئندہ ارتقائی مرحلے میں پرندوں' مگرمچھوں' چھپکلیوں اور سانپوں کے اجداد پیدا ہوئے۔ ڈائنوسار اور ٹیروسار پیدا ہوئے۔ پہلا پرندہ آرکیوپیٹرکس بھی اسی دَور میں پیدا ہوا (آرکیوپیٹرکس کو خزندہ بھی کہا جاتا ہے اور پرندہ بھی) لیکن عجیب بات ہے کہ خزندے (رینگنے والے جانور) جو اس عہد میں اپنے عروج کو پہنچے' اس عہد کے خاتمے تک سب کے سب نابود ہو گئے۔ آج اُن کی باقیات میں صرف کچھوے' مگرمچھ' سانپ اور چھپکلیاں رہ گئے ہیں۔

لیکن یہ عہد جو آج سے چھ کروڑ سال پہلے ختم ہوا' جاتے جاتے دودھ دینے والے (ممالیہ) جانوروں کی نسلیں پیدا کرتا گیا۔ اس عہد میں جو نئے خزندے پیدا ہوئے اُن میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو پستان رکھتے تھے۔ انہی پستان دار خزندوں (Therapsids) سے آگے چل کر دودھ دینے والے جانوروں کی نسلیں پیدا ہوئیں (معذرت کے ساتھ' یہ یاد دلانا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ چھ کروڑ سال کے بعد آدمی بھی اسی گروپ میں سے کسی نسل سے ارتقاء پذیر ہو کر زمین پر نمودار ہوگا!)

(iv) چوتھا یوم (زمانہ) Cainozoic

[عہد جدید۔ ''اربعۃ ایام'' میں سے آخری دن' آخری زمانہ۔ زندگی کا موجودہ اور حالیہ زمانہ]

دودھ پلانے والے جانوروں اور آدمی کا زمانہ آج سے تقریباً چھ کروڑ سال پہلے

شروع ہوا تھا۔ علمائے ارضیات و بشریات نے مل کر اس زمانے کو بھی چھوٹے چھوٹے سات ادوار میں تقسیم کیا ہے:

(۱) اساسِ عہد جدید (Palaeocene): یہ دَور تقریباً ساٹھ لاکھ سال رہا۔ اس عہد کی خشکی کی زندگی کے بارے میں معلومات بہت کم ہیں' کیونکہ ایسی چٹانیں کم ملی ہیں جن میں اس دَور کے خشکی کے جانوروں کے رکازات محفوظ ہوں۔ تاہم ایشیا اور جنوبی امریکا میں کچھ آثار ملے ہیں۔ سمندری خزندے نابود ہو گئے' لیکن دودھ دینے والے جانوروں کے دو گروپ یعنی ابتدائی وہیل مچھلی اور سمندری گائے نے سمندر میں رہتے ہوئے ارتقائی منزلیں طے کرنا شروع کیں۔ مچھلی کی تمام اقسام جو آج سمندر میں پائی جاتی ہیں' سب اسی عہد میں پیدا ہوئیں۔

(۲) آغاز عہد جدید (Eocene): یہ عہد آج سے تقریباً پانچ کروڑ سال قبل شروع ہوا اور تین کروڑ سال قبل تک جاری رہا۔ گویا تقریباً دو کروڑ سال تک چلتا رہا۔ اس عہد میں کھر والے میمل نمودار ہوئے' مثلاً گھوڑا' اونٹ' چوپائے' ہاتھی اور سؤر وغیرہ کے اجداد۔ بڑے بڑے خزندے ختم ہو گئے' لیکن مگرمچھ اور کچھوے کا ارتقاء جاری رہا۔ کیڑے مکوڑوں اور حشرات کی وہ تمام اقسام پیدا ہوئیں جو آج بھی موجود ہیں۔ ابتدائی قسم کے بندر' لیمور' میمون' لنگور' گبن پیدا ہوئے جو کہ بن مانس کی نسل سے ہیں۔ اس عہد کے حیوانات رئیسہ کے رکازات اگرچہ زیادہ نہیں ملے' تاہم اس عہد کے دودھ پلانے والے جانوروں کے ظہور و ارتقاء کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ حیوانات رئیسہ (Primates) دودھ پلانے والے جانوروں میں سب سے اونچے درجے کے حیوانات میں شمار ہوتے ہیں' مثلاً بندر' لنگور' چمپانزی اور لیمور (اور پھر معاف کیجئے' آدمی!)۔ اس عہد کی خاص بات جو قابلِ ذکر ہے' وہ یہ ہے کہ حیوانات رئیسہ کی کچھ اقسام نے ارتقاء کی منازل طے کر کے دو ایسی خصوصیات حاصل کر لی تھیں جو آج کل کے میمل میں ہیں' یعنی:

(ا) ہاتھوں اور پاؤں کا کسی چیز کو پکڑنے اور جکڑنے کے قابل ہونا اور اپنی قابلیت کی بنا پر درختوں کی ٹہنیوں پر جھولنے کی صلاحیت رکھنا۔

(ب) جسم اور دماغ کے سائز کا وہ تناسب جو آج کے انسان کے قریب ترین ہے۔

(۳) اوائل عہد جدید (Oligocene): یہ عہد پچاس ساٹھ لاکھ سال رہا۔

خشکی کے قطعات بڑھتے گئے اور سمندر پیچھے ہٹتے گئے۔ کوہ ایلپس کا پہاڑی سلسلہ بننا شروع ہوا۔ چونکہ دنیا کے بعض حصوں میں سرد موسم آ گیا تھا اس لئے وہاں جنگلات کم ہو گئے اور گھاس کے وسیع و عریض میدان وجود میں آئے۔ اس کے نتیجے میں گھاس خور میمل بھی نمودار ہوئے' جبکہ اس سے پہلے زیادہ تر درختوں سے پتے کھانے والے جانور ہی تھے۔ موجودہ بلیوں' کتوں اور ریچھوں کا ارتقاء شروع ہوا۔ پودے خور جانور مثلاً چھوٹے ہاتھی اور کُھر والے جانور پیدا ہوئے۔ ایک ابتدائی قسم کا بن مانس پیدا ہوا جس کی دُم نہیں تھی۔ تاریخ کا عظیم الجثہ میمل اسی عہد میں وسطی ایشیا میں ظاہر ہوا جس کو ''اندرا کوتھیریم'' کہا جاتا ہے۔ یہ ایک لمبی گردن والا نیوسارس تھا' جس کا قد پاؤں سے لے کر کندھوں تک عموماً پانچ میٹر کے قریب تھا۔

(۴) جدید ممالیہ کا عہد (Miocene): جیسا کہ اس عہد کے نام سے ظاہر ہے' یہ دودھ پلانے والے جانوروں کے ظہور کا عہد ہے۔ یہ عہد تقریباً پونے دو کروڑ سال کے عرصے پر محیط ہے۔ اس عہد کے دَوران میں سمندر کا رقبہ مزید کم ہو گیا اور بحیرۂ روم خشکی میں گھر گیا۔ براعظم یورپ اور براعظم ایشیا کی زمین آپس میں مل گئی۔ ان کے بیچ میں جو سمندر تھا وہ غائب ہو گیا۔ بارشیں بڑھ گئیں۔ زمین کے مزید تغیرات سے کوہ ہمالیہ مکمل ہو گیا۔ آتش فشاں لاوا بہت زیادہ پھوٹتا رہا۔ موسموں میں فرق نمایاں ہوتا گیا' بعض جگہ زیادہ خشک اور بعض جگہ زیادہ سرد۔ مچھلی کی اقسام میں اضافہ ہوتا گیا۔ شارک مچھلی تعداد اور حجم میں بڑھ گئی۔ اس عہد میں یوریشیا کا بیشتر علاقہ جنگلات سے بھر گیا۔ اس عہد کے اواخر میں یوریشیا اور افریقہ کے درمیان ایک زمینی پل پر سے بندر اور بن مانس شمالی براعظموں کی طرف منتقل ہوئے۔ ایک مانس ''پروکونسل'' جو وسط افریقہ میں رہتا تھا' ایشیا اور یورپ میں نقل مکانی کر گیا۔ ایک اور دیوقامت مانس' جس کا نام ''ڈاریوپتھی کس'' تھا اور جو بعد میں معدوم ہو گیا' آج کل کے موجودہ مانسوں کا جدِ امجد سمجھا جاتا ہے۔ آج کل چار قسم کے مانس دنیا میں موجود ہیں: چمپانزی' گوریلا اور گبن۔ اسی عہد کے اواخر میں ''رام مانس'' ظہور میں آیا۔

(۵) جدید تر عہد (Pliocene): یہ عہد تقریباً پچاس لاکھ سال پر پھیلا ہوا ہے' یعنی آج سے ساٹھ لاکھ سال پہلے شروع ہو کر دس لاکھ سال قبل تک جاری رہا۔ اس عہد میں کرۂ ارض پر بیشتر علاقوں میں آب و ہوا سرد اور خشک ہو گئی۔ گھوڑوں اور سینگ دار جانوروں کی نسلوں میں تنوع ہوا۔ اسی عہد میں جانوروں کو جنگل اور میدان میں سے کسی ایک کو اپنا مسکن منتخب کرنے کا مرحلہ درپیش آیا۔ چنانچہ کچھ جانور جنگلی بن گئے اور کچھ میدانی۔

دودھ پلانے والے جانوروں کی انواع کم ہوگئیں' سوائے مانس نما آدمی (Hominids) کے۔ جنگلوں میں رہنے والے اس مانس میں جنوبی مانس (آسٹریلوپتھی کس) بھی شامل تھا' جسے ماہرین بشریات (Anthropology) نے مزید تحقیق و مطالعہ کی سہولت کی خاطر (صحیح یا غلط طور پر) ''نسل انسانی کا باپ'' سمجھ رکھا ہے۔ اس عہد میں جنوبی مانس نے کھلے میدان میں سیدھا کھڑا ہوکر دو ٹانگوں پر چلنا شروع کیا۔ اس نے اوزار بنانے بھی سیکھے۔ اوزار بنانے کی صلاحیت و محنت نے اسے مزید ترقی دی اور آنے والے زمانے میں وہ ارتقاء کے بلند ترین مرحلے میں داخل ہوکر آدمی بنا۔

(۶) برفانی عہد (Pleistocene): یہ عہد آج سے دس بارہ لاکھ سال قبل شروع ہوا اور دس گیارہ ہزار سال قبل ختم ہوا۔ اس عہد کے دوران میں بار بار زبردست موسمی تبدیلیاں ہوئیں۔ بار بار زمین کے بیشتر حصوں پر' خصوصاً شمالی حصوں پر برف کی دبیز چادریں چھا گئیں' جن کی موٹائی دس ہزار فٹ (تین ہزار میٹر) یا اس سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔ اور پھر بار بار یہ برف پگھل گئی۔ اس عہد کے دوران میں برف جمنے اور پگھلنے کے آٹھ بڑے برفانی ادوار (Ice Ages) کی نشان دہی ہو چکی ہے۔ آخری برفانی دور آج سے دس ہزار سال قبل ختم ہوا' یعنی اُس وقت سے جبکہ موجودہ انسان نے زمین پر قدم جمانا شروع کیا۔ زمین کی پوری ارضیاتی تاریخ میں یہ آخری اور آٹھواں برفانی دور تھا۔ پہلا برفانی دور ستاون کروڑ سال پہلے کیمبری عہد میں آیا تھا۔ اس شدید موسمی کایا پلٹ کی بناء پر جانداروں کی اقسام معدوم ہوگئیں اور بہت سی اقسام میں زبردست ارتقاء ہوا۔ ارتقاء کا انقلابی یا کیفیتی تبدیلی کا مرحلہ اُسی عہد میں وقوع پذیر ہوا۔ اسی عہد میں جدید انسان موجودہ شکل وصورت میں ظہور پذیر ہوا۔

(۷) عہد حاضر (Holocene): یہ عہد گزشتہ دس گیارہ ہزار سال کے عرصے پر محیط ہے۔ اور اسے Recent (عہد جاریہ) بھی کہا جاتا ہے۔ عہد حاضر کے آغاز سے پہلے ہی آخری برفانی دور کی برف پگھلنا شروع ہوگئی تھی۔ سائنس دانوں کی رائے یہ ہے کہ سورج کی تاب کاری بڑھ جانے کی وجہ سے زمین پر گرمی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ اس عہد میں زندہ مخلوقات کی نسلوں میں کوئی جسمانی تبدیلی واقع نہیں ہوئی' ماسوائے دو باتوں کے' کہ ایک تو انسانی آبادیوں میں اضافہ ہوا اور دوسرے عظیم الجثہ میمل تیزی سے معدوم ہوگئے۔

خشکی پر ڈائنوسار کی جگہ دودھ پلانے والے جانوروں نے لے لی۔ سمندر میں

اکتھیو سار اور پلیو سار کی جگہ وہیل مچھلی اور سمندری گائے نے لے لی' اور یہ دونوں پستانی جانور ہیں اور ہوا میں پٹروسار کی جگہ چمگادڑ (پستانی جانور) اور پرندوں نے لے لی۔

پرندے اپنی خصوصیات کی وجہ سے نچلے درجے کے تمام جانوروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ان کا جسم ایسی چیز سے ڈھکا ہوا ہے جو گرمی اور سردی کو روک سکتی ہے۔ ان کے خون کی نالیاں یعنی وریدیں (گندے خون کی نالیاں) اور شریانیں (صاف خون کی نالیاں) الگ الگ ہیں۔ ان کے جسم کا درجۂ حرارت ایک خاص ضابطے میں ہے۔ ان کے تحول وہضم کا نظام شاندار ہے۔ یہ فضا میں اڑ سکتے ہیں۔ ان کی آواز میں بہت پختگی ہے۔ سماعت اور بصارت بہت تیز ہے۔ اکثر پرندے اپنے ساتھیوں کو آواز دے سکتے ہیں' گا سکتے ہیں۔ بعض پرندے آواز کی اونچ نیچ سے دوسروں کو اطلاعات فراہم کرتے ہیں۔ ان کا بچوں کی پرورش کا مخصوص طریقہ ہے۔ ان خصوصیات کے لحاظ سے پرندے رینگنے والے جانوروں سے برتر ہیں' اور دودھ پلانے والے جانوروں کے مقابل آ جاتے ہیں۔

دودھ پلانے والے جانور تمام مخلوقات میں سب سے بلند رتبے پر فائز ہیں' جن کی شاخ دو چار واسطوں سے انسان تک پہنچتی ہے۔ یہ گرم خون رکھتے ہیں۔ پھیپھڑے کے ذریعے سانس لیتے ہیں۔ جسم پر بال ہیں۔ ریڑھ کی ہڈی رکھتے ہیں۔ ان کی جلد کے اندر پسینہ اور چکنائی پیدا کرنے والے غدود ہیں۔ جبڑوں میں متفرق قسم کے دانت ہیں۔ اعضاء' ٹانگوں اور بازوؤں کا ارتقاء چلنے پھرنے' اوپر چڑھنے' زمین کھودنے اور تیرنے کی طرف ہوا۔ پاؤں کی انگلیوں میں پنجے ہیں یا ناخن یا کُھر۔ جسم کا درجۂ حرارت ضابطے میں ہے۔ دل کے اندر چار خانے ہیں۔ پھیپھڑے بڑے اور لچک دار ہیں۔ پیٹ اور سینے کے جوف کے درمیان ڈایا فرام کا پردہ ہے۔ بارآوری اور تولید وتناسل کا نظام جسم کے اندر ہے۔ انڈے بہت چھوٹے ہیں۔ چند ایک نچلی سطح کے پستانی جانوروں کے سوا' باقی سب کے بچے رحم مادر میں جمتے اور پلتے ہیں۔ پیدائش کے بعد بچے کو ماں اپنے پستان سے دودھ کی غذا دیتی ہے۔ یہ تمام خصوصیات آنول پر پلنے والے جانوروں مثلاً چمگادڑ' کتے' بلی' بکری' بھیڑ' ہاتھی' بندر' اونٹ' گھوڑے' وہیل اور آدمی میں مشترک ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زندہ مخلوقات تبدیلی وترقی کے کن کن مراحل سے گزری ہیں؟ یک خلوی ایبا (Amoeba) سے شروع ہو کر کثیر خلوی انسان تک ارتقاء کیسے اور کیونکر ہوا؟ اس سوال کا جواب آئندہ شمارے میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

والدین اور سرپرستوں کی وفات کے بعد
کیا لڑکا اپنی منگیتر سے نکاح کرنے میں خود مختار ہے؟
ایک استفتاء اور اس کا جواب

استفتاء: ایک بالغ لڑکا اور بالغ لڑکی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ دونوں کے والدین تک یہ بات پہنچتی ہے تو ان دونوں کے والدین اور قریبی رشتہ دار بھی اس بات کو پسند کرتے ہیں اور ان کی منگنی کر دیتے ہیں۔ اس بات کو ایک سال گزر گیا۔ شادی کی تیاری ہو رہی تھی' فریقین کے درمیان حق مہر بھی طے پا گیا تھا' البتہ نکاح ابھی نہیں ہوا تھا کہ اچانک لڑکے کے والدین' بہن بھائی' رشتہ دار اور سرپرست ایک ٹریفک حادثے میں فوت ہو گئے۔ یوں وہ لڑکا تنہا رہ گیا۔ کیا یہ حادثہ طرفین کے درمیان نکاح میں رکاوٹ بن سکتا ہے؟ یا لڑکا خود مختار ہونے کی بنا پر اس لڑکی کے ساتھ نکاح کرنے کا مجاز ہے جس کے ساتھ اس کی منگنی طرفین کے والدین پہلے ہی کر چکے ہیں؟؟

(محمد عدنان خٹک' سول' کوریا)

جواب: والدین اور رشتہ داروں کی موجودگی میں بالغ مرد اور لڑکی کی منگنی ان کی رضامندی سے ہو جانے کے بعد اگر والدین کا انتقال ہو جائے تو اس منگنی کے رشتے کو رشتہ نکاح میں بدلنے کے لئے لڑکا اور لڑکی خود مختار ہیں' چاہے تو نکاح کر لیں چاہے تو منگنی ختم کر دیں' لیکن بلاوجہ منگنی ختم کرنا صحیح نہیں' کیونکہ صرف منگنی کی صورت میں جو قول و قرار ہوا ہے اسے ختم کرنے کے لئے لامحالہ معقول وجوہات بھی ہونی چاہئیں۔ اور اگر منگنی کے وقت ایجاب ہو قبول بھی وہ گیا ہو تو نکاح منعقد ہو گیا۔ اب بلا کسی عذر شرعی طلاق دے کر اس رشتہ کو منقطع کرنے کی اجازت نہیں' کیونکہ ابغض الحلال الی اللہ الطلاق۔

(حافظ نذیر احمد ہاشمی' رکن ادارۂ تحریر)

بقیہ: اُمّ المُسبّحات: سورۃ الحدید

حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے پاس تشریف لائے اور انہوں نے تسلی دی کہ نہیں' اللہ آپ کو ضائع نہیں کرے گا۔ تو درحقیقت اُمت کی عورتوں میں سب سے اونچا مقام حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق ﷺ کی ہم پلہ شخصیت وہی ہیں۔

زیر درس آیت مبارکہ کے کچھ پہلو ابھی باقی رہ گئے ہیں' وہ اِن شاء اللہ اگلے درس میں بیان ہوں گے۔

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم ونفعني وإياكم بالآيات والذكر الحكيم

بقیہ: مصارفِ زکوٰۃ اور مصالح اُمت محمدیؐ

عام خوشحالی ہوگی' کوئی جنگیں نہیں ہوں گی' تمام ممالک کا فوجی اور اسلحہ کا بجٹ فلاحی کاموں میں لگے گا۔

ایسے حالات میں جو یقیناً وارد ہو کر رہیں گے' ابھی تو اس وقت کے علماء کو مزید اجتہادات کرنے ہوں گے اور زکوٰۃ اور اس کے مصارف پر غور وفکر لازمی ہو جائے گا' اور ہمارے ایمان کا تقاضا ہے کہ اُس وقت کے علماء وفقہاء یقیناً ہمارے اسلاف کی طرح اپنا فرض اجتہاد ادا کریں گے اور مسلمان اُمت کی صحیح رہنمائی کریں گے۔ اے کاش! کہ آج کے علماء وفقہاء بھی جو اِس منصب کے اہل ہیں' وہ حالاتِ حاضرہ میں رہنمائی کا حق ادا کریں۔

اللھم وفقنا لما تحب وترضی' اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔ آمین یارب العلمین!

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجئے۔

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف

جسے بجا طور پر سلسلہ اقبالیات میں ''بقامت کہتر و لے بقیمت بہتر''
کی مصداق کامل قرار دیا جا سکتا ہے

علامہ اقبال اور ہم

مع

فکر اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کا جائزہ
اور ہماری قومی ذمہ داریاں

☆☆☆

❁ حیات و سیرتِ اقبال ❁ فلسفہ اقبال
❁ ملت اسلامیہ کے نام علامہ اقبال کا پیغام

(از قلم : پروفیسر یوسف سلیم چشتی

☆☆☆

❁ اقبال اور قرآن ' از قلم: سید نذیر نیازی

قارئین کی سہولت کے لئے فارسی اشعار کا اردو ترجمہ بھی شامل کتاب کیا گیا ہے

قیمت: اشاعت خاص (سفید کاغذ' پائیدار و خوبصورت جلد) 72 روپے
اشاعت عام: (نیوز پیپر ایڈیشن) 30 روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 03-5869501' فیکس: 5834000